امامت وولایت

مؤلف

ولی فقیہ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ

سید علی الحسینی الخامنہ ای مدظلہ العالی

ناشر

معراج کمپنی لاہور

نام کتاب .... امامت وولایت

مؤلف .... ولی فقیہ حضرت آیت اللہ سید علی الحسینی الخامنہ ای مدظلہ العالی

اردو تصحیح و پروف ریڈنگ .... مجاہد حسین حرّ

کمپوزنگ .... قائم گرافکس۔جامعہ علمیہ۔ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... معراج کمپنی لاہور

ہدیہ ....

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی لاہور

بیسمنٹ میاں مارکیٹ،غزنی سٹریٹ اردو بازار۔لاہور

03214971214،04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

03335234311

عرض ناشر

حمد ہے اس ذات کے لئے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا اور درود و سلام ہو اس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جسے اس نے عالمین کے لئے سراپا رحمت بنا کر مبعوث فرمایا اور سلام ورحمت ہو ان کی آل پر جنہیں اس نے پورے جہاں کے لئے چراغ ہدایت بنایا۔

جب سے ادارہ قائم کیا ایک خواہش تھی کہ آقائی رہبر معظم سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کی کتابیں شائع کی جائیں لیکن مصروفیات اور کچھ آقائی موصوف کی کتب کی غیر دستیابی کی بنا پر اس خواہش کی تکمیل میں تاخیر ہوئی۔ لیکن اب الحمد للہ جناب مولانا مجاہد حسین حرؔ صاحب نے رہبر معظم کی کتب فراہم کرنے کی ذمہ داری لی اور انھوں نے خداوند قدوس کی بارگاہ سے امید ظاہر کی ہے کہ انشاء اللہ سو (۱۰۰) سے زائد کتب فراہم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ اور ان کی اس سعی جمیلہ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

"امامت وولایت" ولی فقیہ حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں امامت وولایت کے اہمیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے انداز و تبلیغ ورسالت کو بیان کیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب کی اشاعت ہمارے لئے کسی بڑے اعزاز سے کم نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور اسلامی تعلیمات کے فروغ اور دین الٰہی کی نشر واشاعت کے لئے کام کر رہے ہیں، ہماری دعا ہے رب العزت تمام امت مسلمہ کو عزت وسربلندی عطا

فرمائے اور ہم سب کو ہر طرح کی بداخلاقی اور دیگر آفات و بلیات سے محفوظ رکھے۔(آمین)

قارئین کرام کو ہم یہ بھی بتادینا چاہتے ہیں بہت جلد معراج کمپنی کی ویب سائیٹ بنا کر آقائی رہبر معظم کی تمام کتابیں اس پر لوڈ کردی جائیں گی۔

ادارہ معراج کمپنی شیخ محمد باقر امین صاحب کی دادی مرحومہ کے نام پر قائم کیا گیا ہے۔مومنین کرام سے درخواست ہے کہ مرحومہ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

ادارہ

فہرست کتاب

ولایت کا بنیادی مفہوم

ہماری گفتگو ولایت کے موضوع پر ہے۔ہم ولایت کے موضوع کو جس طرح قرآن مجید سے اخذ کرتے ہیں،اس طرح اِسے بہت ہی کم بیان کیا جاتا ہے۔البتہ ایک شیعہ کی سماعتیں ولایت کے لفظ سے خوب اچھی طرح مانوس ہیں۔ ہماری دعاؤں، خداوند عالم سے ہماری مناجاتوں، ہماری رویت اور ہمارے یہاں رائج اور عمومی افکار میں ولایت کا موضوع انتہائی تقدس اور احترام کے ساتھ موجود ہے۔ہم ایک شیعہ کے طور پر اپنے آپ کو ہمیشہ حاملِ ولایت سمجھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا ہمیں ولایت پر قائم رکھے اور ہماری موت ولایت پر رہتے ہوئے واقع ہو۔

ہم ولایت کے بنیادی مفہوم کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔اس گفتگو میں ہم یقیناً علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت پر بھی پہنچیں گے،لیکن فی الحال ہماری گفتگو اس سے پہلے کے مراحل کے بارے میں ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ولایت کا مفہوم قرآن مجید کی آیتِ کریمہ سے اخذ کریں۔تاکہ آپ دیکھیں کہ ولایت کا اصول کس قدر وسیع اور دل کش اصول ہے،اور کس طرح اگر ایک قوم، ایک گروہ، ایک عقیدے کے پیروکار افراد ولایت کے حامل نہ ہوں،تو افراتفری اور انتشار کا شکار ہو جائیں گے۔

اس گفتگو کی روشنی میں یہ بات بھی آپ کے سامنے جائے گی اور اسے آپ اچھی طرح

سمجھ لیں گے کہ کیوں ولایت نہ رکھنے والے شخص کی نماز، نماز نہیں ہوتی، روزہ، روزہ نہیں ہوتا اور عبادات، عبادات نہیں ہوتیں۔

اس گفتگو سے یہ بات بھی بخوبی سمجھ میں سکتی ہے کہ ایک ایسا معاشرہ اور ایک ایسی قوم، جو ولایت نہیں رکھتی، اگر وہ اپنی تمام عمر نماز، روزے میں گزار دے اور اپنے تمام اموال کو صدقہ کر دے، تب بھی لطفِ خدا کے لائق نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ اس بحث کی روشنی میں ولایت کے بارے میں موجود احادیث کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں، ان ہی میں سے یہ معروف حدیث بھی ہے، جس کے بعض جملات اور کلمات کو ہم بارہا دُہرایا کرتے ہیں:

"لَوْ أَنَّ رَجُلاً قَامَ لَيْلَهُ وَ صَامَ نَهَارَهُ وَ تَصَدَّقَ بِجَمِيعِ مَالِهِ وَ حَجَّ جَمِيعَ دَهْرِهِ وَ لَمْ يَعْرِفْ وَلَايَةَ وَلِيِّ اللَّهِ فَيُوَالِيَهُ وَ يَكُونَ جَمِيعُ أَعْمَالِهِ بِدَلَالَتِهِ إِلَيْهِ مَا كَانَ لَهُ عَلَى اللَّهِ جَلَّ وَ عَزَّ حَقٌّ فِي ثَوَابِهِ"[1]

اگر کوئی انسان رات بھر قیام کی حالت میں گزارے، صرف ماہِ رمضان ہی میں نہیں بلکہ پوری عمر سارے سال روزے رکھے، اپنا تمام مال واسباب راہِ خدا میں صدقہ کر دے اور پوری زندگی ہر سال حج پر حج کئے جائے، لیکن وہ خدا کے ولی کی ولایت سے شنا نہ ہو، تا کہ اس شناسائی کے بعد اسکی پیروی کرے اور اسکے نتیجے میں اسکے تمام اعمال خدا کے اس ولی کی رہنمائی کے تحت انجام پائیں، تو ایسے شخص نے جو کچھ انجام دیا ہے، وہ فضول، بے ثمر اور نا کارہ ہے۔

اگر آپ اس گفتگو پر خوب اچھی طرح غور کریں، اور آیت قرآنی سے جو نتائج اخذ کئے جائیں ان پر خوب توجہ دیں، تو یہ بات جان لیں گے کہ ولایت نبوت کا تسلسل ہے، نبوت سے

---

[1] اصولِ کافی۔ باب دعائم الاسلام۔ حدیث پنجم

جدا کوئی چیز نہیں، بلکہ دراصل نبوت کا تتمہ، ضمیمہ اور اختتامیہ ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ اگر ولایت نہ ہو، تو نبوت بھی ناقص رہ جائے گی۔ لہٰذا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہم نبوت کے بارے میں ایک مختصر سی گفتگو کریں، اسکے کلیات بیان کریں، تا کہ ضمنی گفتگو کرتے ہوئے بتدریج ولایت کے موضوع میں داخل ہوں۔ البتہ یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس موضوع پر گفتگو کرنا انتہائی دشوار کام ہے، اور اسے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اس سے بھی زیادہ کٹھن، کیونکہ ولایت کے موضوع پر عام افراد کے اذہان میں اس قدر کمزور، کھوکھلے اور غیر منطقی مسائل جگہ بنا چکے ہیں، کہ جب آپ قرآن اور حدیث کے متن سے مطابقت رکھنے والی درست بات بیان کریں گے، تو ان دو میں سے کوئی ایک صورت پیش آئے گی۔ یا تو یہ کہ جو باتیں آپ بیان کریں گے وہ لوگوں کے اذہان میں موجود باتوں سے گڈ مڈ ہو جائیں گی، اور یا یہ کہ جو کچھ ولایت کے عنوان سے بیان کیا جائے گا، لوگ اس سے بیگانگی محسوس کریں گے۔ لہٰذا یہ بحث انتہائی مشکل اور دشوار ہے۔ لیکن ہم خدا کے فضل سے توفیق طلب کرتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ اس گفتگو کو چند دنوں میں مکمل کر دیں انشاء اللہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا مقصد کیا تھا؟

پیغمبرؐ انسانوں کو کمال تک پہنچانے کے لئے آئے ہیں، لوگوں کو اخلاقِ الٰہی سے مزین کرنے کے لئے آئے ہیں، مکارمِ اخلاق کو کامل کرنے اور اتمام تک پہنچانے کے لئے آئے ہیں، اور احادیث کے مضمون کے مطابق

اِنِّیْ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ [1]

پیغمبر انسان سازی کے لئے آئے ہیں، انسان نامی اس خمیر کو سنوارنے اور اسے راستہ و پیراستہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔

اب دیکھنا یہ چاہئے کہ پیغمبرؐ انسان سازی کے لئے کون سے راستے اختیار کرتے ہیں؟ کن ذرائع سے استفادہ کرتے ہیں؟ اور کس طریقے سے انسان بناتے ہیں؟

کیا کوئی مدرسہ قائم کرتے ہیں؟

کیا کوئی فلسفی مکتب بناتے ہیں؟

صومعہ اور عبادت خانہ تعمیر کرتے ہیں؟

پیغمبرؐ انسان بنانے کے لئے انسان سازی کا کارخانہ قائم کرتے ہیں۔ پیغمبرؐ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ چاہے انہیں دس سال، بیس سال تاخیر سے کامیابی نصیب ہو، لیکن جو چیز وہ

---

[1] إرشاد القلوب / ترجمه مسترحمی / ج1 / 174 / باب هیجدهم در وصایای لقمان و مواعظ رسول خدا ..... ص: 164

تیار کریں وہ ایک انسان، دو انسان، بیس انسان نہ ہوں، بلکہ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ انسان سازی کا ایسا کارخانہ قائم کریں جو خودکار (automatic) انداز میں پیغمبر کی پسند کے انسانِ کامل تیار کرے۔

پس پیغمبرؐ انسان بنانے کے لئے، انسان سازی کے کارخانے سے کام لیتے ہیں اور یہ کارخانہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام ہے۔ یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جو ہماری گفتگو میں توجہ کا مرکز رہے گا۔

سب یہی کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ انسان بنانا چاہتے ہیں، تمام ہی لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ پیغمبر تعلیم وتربیت کے لئے آئے ہیں اور سب یہ بات سمجھتے ہیں، (لیکن) جس بات کو توجہ کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ پیغمبر ایک ایک انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے تنہائی میں لے جا کر اس کے کان میں خدا کی محبت کے نغمے نہیں گنگناتے تھے۔ انبیاعلیہم السلام نے ایسے علمی اور فلسفی مدارس (بھی) قائم نہیں کئے جن میں چند شاگردوں کی تربیت کی ہو اور اُنہیں لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے گوشہ وکنارِ عالم میں روانہ کیا ہو۔ پیغمبر کا کام ان امور سے زیادہ محکم، مضبوط اور گہرا ہے، (وہ) ایک ایسا کارخانہ قائم کرتے ہیں، جو صرف انسان پیدا کرتا ہے، اور وہ کارخانہ "اسلامی معاشرہ" ہے۔

اسلامی معاشرہ کیا ہے؟

اور اس کی کیا ماہیت ہے؟

البتہ یہ ایک علیحدہ بحث ہے، جو ہماری اس گفتگو کا حصہ نہیں۔ لیکن اس مفہوم کی کچھ وضاحت کے لئے ہم اس پر مختصراً روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ،یعنی وہ معاشرہ اورسماج جس کی حکمرانی کا سب سے بلند مقام خدا کے پاس ہو۔ اس معاشرے کے قوانین، الٰہی قوانین ہوں، اس معاشرے میں حدودِالٰہی جاری ہوں، اس معاشرے میں عہدہ اورمنصب الٰہی تعلیمات کی روشنی میں تفویض کیا جاتا ہواورانہی تعلیمات اوراصولوں کی روشنی میں عہدے اورمنصب سے معزول کیا جاتا ہو۔

جس طرح بعض معاشرہ شناسوں میں معمول اورمروج ہے،اسی طرح اگرہم معاشرے کی تصویرکشی ایک مثلث (triangle) کی صورت میں کریں،تو (اسلامی معاشرے کی) مثلث کی چوٹی (top) (پر خدا ہوتاہے، اورتمام انسان اسکے نیچے ہوتے ہیں۔ اس معاشرے کے ادارے دینی بنیاد پرقائم ہوتے ہیں،صلح اور جنگ کے قانون احکامِ الٰہی کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں، اجتماعی روابط، اقتصاد، حکومت، حقوق، تمام چیزوں کا تعین خدا کا دین کرتا ہے، دین الٰہی کی روشنی میں ان کا نفاذ ہوتاہے، اوران تمام قوانین کی پشت پر خدا کا دین ہوتا ہے۔

اسے کہتے ہیں اسلامی معاشرہ۔

اسی طرح جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ تشریف آوری کے بعد وہاں ایک معاشرہ تشکیل دیا۔ اس معاشرے پر خدا کی حکمرانی تھی، اورعملاً حکومت کا کنٹرول خدا کے نمائندے رسولؐ کے ہاتھوں میں تھا۔ آپ ہی قوانین واحکام وضع کرتے اوراُن کا اجرا کیا کرتے تھے۔ معاشرے کی ہدایت ورہبری اوراس کا نظم ونسق آنحضرتؐ کے ذمے تھا۔

ایک ایسے معاشرے میں جس کا سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے، نمازِ جماعت، نماز کے بعد خطبہ اورمیدانِ جنگ میں پڑھے جانے والے ترانے، سب ایک ہی رنگ لئے ہوتے ہیں۔ اسی مسجد میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازِ جماعت قائم کیا کرتے تھے، لوگوں سے خطاب کے لئے منبر پر جایا کرتے تھے، درس دیتے اورتزکیہ وتعلیم کا کام انجام دیا کرتے تھے، وہیں جہاد کا پرچم لایا جاتا تھا، پیغمبرؐ اسے باندھتے اوراسامہ بن زید، یاکسی دوسرے مومن سپہ سالار کے سپرد

کرتے اور فرماتے کہ جاؤ:

اِنْطَلِقُوا عَلَى اِسْمِ الله[1]

اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو۔

اور اس موقع پر دشمن پر کامیابی کے حصول کے لئے ضروری ہدایت دیا کرتے تھے۔

اسی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کا حکم جاری فرماتے تھے، اسی مسجد میں پیغمبر کی عدالت سجتی، اسی مسجد سے پیغمبرؐ معاشرے کا نظم ونسق اور اقتصاد چلاتے، اسی مسجد میں زکات جمع ہوتی اور یہیں سے تقسیم کی جاتی، اسی میں درس ہوتا، نماز ہوتی، دعا ہوتی اور جنگی ترانے ہوتے، مالی اور اقتصادی مسائل حل ہوتے، مختصر یہ کہ خانہ خدا میں دنیا اور خرت کے امور ایک ساتھ پیغمبر کی رہنمائی میں انجام پاتے۔ یہ ہے اسلامی معاشرہ۔

انبیا علیہم السلام ایسے ہی معاشرے کے قیام کے لئے آتے ہیں، اس معاشرے میں رہنے والا ہر فرد انسان بن جاتا ہے۔ اگر انسانِ کامل نہ بھی بن سکے (تب بھی) مجبور ہوتا ہے کہ انسانوں کا سا طرزِ عمل اختیار کرے۔ جو کوئی اچھا بننا چاہے، وہ پیغمبرؐ کے قائم کردہ معاشرے میں اچھا بن سکتا ہے۔ جبکہ غیر الٰہی معاشروں میں ایسا ممکن نہیں ہے۔

غیر اسلامی اور غیر الٰہی معاشروں میں انسان اچھا بننا چاہتے ہیں، لیکن نہیں بن سکتے۔ دیندار بننا چاہتے ہیں، لیکن نہیں بن سکتے۔ چاہتے ہیں کہ نہ سود دیں اور نہ سود لیں، لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں کر سکتے۔

ایسے معاشرے میں عورت چاہتی ہے کہ اسلام اُس سے جس پاکدامنی کا تقاضا کرتا ہے، وہ اُس کی حفاظت کرے، لیکن ماحول اُسے ایسا نہیں کرنے دیتا۔ اس معاشرے میں پائے جانے والے عوامل اور اسباب انسان کو خدا کی یاد سے دور کرتے ہیں۔ تصاویر، سنیما گھر، زادانہ

---

[1] صحیح البخاری کتاب المغازی باب قتل کعب بن الاشرف حدیث ۳۸۱۱

میل جول اور گفتگو، یہ سب باتیں انسان کو خدا سے دور کرتی ہیں اور انسان کے دل کو ذکرِ خدا سے بیگانہ کرتی ہیں۔لیکن اسلامی معاشرے میں معاملہ اسکے برعکس ہوتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں بازار، مسجد، حکومتی ادارے، دوست، رشتے دار، گھرانے کا سربراہ، گھر کا جوان، سب کے سب انسان کو خدا کی یاد دلاتے ہیں، خدا کی طرف کھینچتے ہیں، خدا کے ساتھ ہم ہنگ کرتے ہیں، خدا کے ساتھ اس کا ربط و تعلق ایجاد کرتے ہیں، اُسے خدا کا بندہ بناتے اور غیر خدا کی بندگی سے دور کرتے ہیں۔

اگر پیغمبرؐ کے زمانے کا اسلامی معاشرہ پچاس سال قائم رہتا، اور انہی کی قیادت برسرِ کار ہوتی، یا پیغمبرؐ کے بعد علی ابن ابی طالب علیہ السلام، وہی رہبر و رہنما جنہیں پیغمبرؐ نے معین فرمایا تھا، پیغمبر کے جانشین بنتے، تو یقین جانئے پچاس سال بعد اس معاشرے میں کوئی منافق نہ رہتا، تمام افرادِ معاشرہ حقیقی مومن بن جاتے۔ اگر حکومتِ نبوی کے فوراً بعد حکومتِ علوی قائم ہو جاتی، تو یہ انسان ساز معاشرہ لازمی طور پر تمام دھوکے بازوں کو پاک دل بنا دیتا، تمام منافق دلوں کو بھی مومن کر دیتا، وہ تمام افراد جن کی روح ایمان سے شنا نہ تھی، وہ بھی خدا اور ایمان شنا ہو جاتے۔ اسلامی معاشرہ ان خصوصیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔

انبیا علیہم السلام ایسا ہی معاشرہ قائم کرنے کے لئے آتے ہیں۔ جب یہ معاشرہ بن جاتا ہے، تو جس طرح کارخانے سے بڑی مقدار میں پیداوار نکلتی ہے، اسی طرح انسان سازی کے اس کارخانے سے لوگ گروہ در گروہ مسلمان بن کر نکلتے ہیں۔ ظاہری مسلمان بھی اور قلبی، واقعی اور باطنی مسلمان اور مومن بھی۔ پس پیغمبرؐ اس کام کے لئے آتے ہیں۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ ہم ولایت کی گفتگو کو اسکی جڑ سے شروع کریں گے۔

ابتدا میں جب پیغمبر اسلامی فکر لے کر آتے ہیں اور اُن کی دعوت شروع ہوتی ہے، تو کیا وہ تن تنہا معاشرے کا نظم و نسق چلا سکتے ہیں؟ کیا معاشرے کو اداروں کی ضرورت نہیں ہوتی؟ کیا

اِن اداروں کو چلانے کے لئے کچھ لوگ درکار نہیں ہوتے؟ کیا اس معاشرے کے دفاع اور تحفظ اور اسکے دشمنوں کی سرکوبی کے لئے ایک فوج کی ضرورت نہیں ہوتی؟ کیا ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہوتی جو پیغمبر کا ساتھ دیں اور اُن کی دعوت کو عام کریں؟ یقیناً ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ تمام کام معمول کے مطابق اسباب و وسائل کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ انبیاعلیہم السلام اپنی زیادہ تر سرگرمیوں میں عام اور معمول کے مطابق اسباب و وسائل ہی سے کام لیتے تھے۔

پیغمبر اس لئے آتے ہیں تاکہ اپنا مطلوب معاشرہ تعمیر کریں، ایسا معاشرہ جو انسان سازی کا کارخانہ ہو۔ اس کام کے لئے ایک متحد اور یکسو گروہ کی ضرورت ہے، جو دل کی گہرائیوں سے اس مکتب پر ایمان اور عقیدہ رکھتا ہو اور ثابت قدمی اور جوش و خروش کے ساتھ اس مقصد کی جانب گامزن ہو۔ پیغمبر، ابتدائے کار ہی میں ایسے گروہ کی موجودگی ضروری سمجھتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبر کا پہلا کام اس متحد اور باہم متفق گروہ کی فراہمی اور تیاری ہے۔ لہٰذا وہ آیت قرآنی پر عمل کرتے ہوئے مواعظِ حسنہ کے ذریعے ایک ایسا گروہ وجود میں لاتے ہیں:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ؕ.[1]

(اے پیغمبرؐ) آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف (لوگوں کو) بلائیں حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے بہترین انداز میں بحث و مباحثہ کریں۔

پیغمبر مواعظِ حسنہ، آیت قرآنی اور اپنے کلام کی تاثیر کے ذریعے لوگوں کے دل خدا کے دین کی جانب جذب کرتے ہیں اور پہلے مرحلے میں اُنہیں اپنے گرد جمع کرتے ہیں۔ پیغمبر کے گرد جمع ہوجانے والے ان لوگوں کے ذریعے ایک گروہ وجود میں آتا ہے۔ پس سب سے پہلے پیغمبر اپنی دعوت پیش کرکے ایک گروہ اور ایک صف وجود میں لاتے ہیں۔ کفر کے محاذ کے با

---

[1] سورہ نحل ۱۶۔ آیت ۱۲۵

لمقابل ایک محاذ ایجاد کرتے ہیں۔

یہ محاذ کن لوگوں سے مل کر بنتا ہے؟

صاحبِ ایمان، صاحب عقیدہ، مضبوط دل اور ثابت قدم مسلمانوں کے ملنے سے بنتا ہے، اُن لوگوں کے اکٹھا ہونے سے تشکیل پاتا ہے جنہیں راہِ خدا سے نہیں ہٹایا جاسکتا۔

لَا تَأْخُذُهُمْ فِي اللهِ لَوْمَةُ لَآئِمٍ [۱]

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت راہِ خدا سے نہیں ہٹاسکتی۔

یہ وہ اوّلین مسلمان ہیں جو جاہلی معاشرے میں ایک محاذ تشکیل دیتے ہیں۔ یعنی یہ مکہ کے جاہلی معاشرے میں رہنے والے صدرِ اسلام کے مسلمان ہیں۔ اب اگر اسلام اور مسلمین کے نام سے وجود میں نے والے اس کمزور اور لاغر محاذ کو اس جاہلی اور مزاحمتوں اور مشکلات سے بھرے معاشرے میں باقی رکھنا چاہیں، اگر یہ چاہیں کہ یہ گروہ، یہ صف اور یہ محاذ ختم نہ ہوجائے، تحلیل نہ ہوجائے، تو لازم ہے کہ مسلمانوں کا یہ گروہ سیسہ پلائی دیوار کی مانند ایک دوسرے کے ساتھ پیوست رہے، ان مسلمانوں کو اس طرح ایک دوسرے سے متصل اور منسلک کیا جائے کہ کوئی چیز اُنہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کرسکے۔ آج کی زبان میں اور آج کی ادبیات میں، ایک انتہائی شدید جماعتی نظم (party discipline) ان مسلمانوں کے درمیان قائم کیا جائے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیوست کیا جائے۔ انہیں مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھا جائے اور دوسرے محاذوں، دوسری تحریکوں اور مخالف عوامل سے انہیں زیادہ سے زیادہ دور رکھا جائے۔ کیوں، اس لئے کہ یہ اقلیت میں ہیں۔

ایک ایسا گروہ جو اقلیت میں ہے، ممکن ہے اسکی فکر اکثریت کی فکر سے متاثر ہوجائے، اِن کا عمل، اِن کی حیثیت، اِن کی شخصیت، ممکن ہے ان کی مخالف بقیہ اکثریت کی حیثیتوں،

---

[۱] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۰

شخصیتوں اور اعمال میں گم یا نابود اور حل ہو کر ختم ہو جائے۔

لہٰذا اُنہیں تحلیل ہونے سے بچانے کے لئے، انہیں نابودی سے محفوظ رکھنے کے لئے، انہیں ایک گروہ کی صورت میں باقی رکھنے کے لئے، انہیں زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ متصل کیا جاتا ہے، اور انہیں ہر ممکن طریقے سے دوسرے محاذوں، دوسری صفوں سے جدا کیا جاتا ہے، تاکہ مستقبل میں ان کے مضبوط ہاتھوں سے اسلامی معاشرے کی تعمیر ہو، یہ اس کا نظم و نسق سنبھالیں اور اسے آگے بڑھائیں، پیغمبر کے مددگار بنیں، اُن کوہ پیماؤں کے گروہ کی مانند جو ایک دشوار گزار پہاڑی راستہ عبور کر رہا ہوتا ہے، دس افراد لاٹھیاں (sticks) ہاتھ میں لئے برف کے درمیان ایک تنگ اور پُرخطر راستہ طے کر رہے ہوتے ہیں، اور پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے پیچ وخم کھاتی وادیوں سے گزرتے ہیں۔ ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ایک دوسرے سے متصل ہو جائیں، اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ لیں، علیحدہ علیحدہ اور انفرادی طور پر آگے نہ بڑھیں۔ کیونکہ اگر وہ اکیلے رہ جائیں گے، تو ان کے لڑکھڑانے کا خطرہ ہے، انہیں مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے سے منسلک کر دیتے ہیں، اور ایک دوسرے سے جوڑنے کے ساتھ ساتھ ان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ بہت زیادہ وزن نہ لیں، اِدھر اُدھر نہ دیکھیں، بلکہ صرف اپنے راستے پر نظر رکھیں، اور حواس فقط اپنے کام کی طرف متوجہ رکھیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی کمر اور ہاتھوں کو مضبوطی سے ایک ساتھ باندھ لیتے ہیں، تاکہ اگر ان میں سے کوئی گرنے لگے، تو بقیہ لوگ اسے بچا سکیں۔

کوہ پیماؤں کا اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے جڑا ہوا ہونا، صدرِ اسلام کے مسلمانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ شدید متصل اور پیوست ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔

کیا قرآن وحدیث نے اس اتصال اور پیوستگی کو کوئی نام دیا ہے؟

اسلام کے ابتدائی دور سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی یہ پیوستگی، جو انہیں پس میں

اس طرح جوڑتی ہے جس کا توڑنا ممکن نہیں، جو معاشرے میں موجود دوسری صفوں سے یکسر جدا ہوتے ہیں، سختی کے ساتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اور ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں، کیا قرآن اور حدیث میں انہیں کوئی نام دیا گیا ہے؟

جی ہاں، اس باہم پیوستگی اور اتصال کا نام ولایت ہے۔

پس قرآن کی اوّلی اصطلاح میں، ولایت یعنی باہم پیوستگی اور ایک صف کی صورت میں یک جہت ہونا، ایک فکر رکھنے والے، ایک مقصد کی جستجو میں سرگرداں اور ایک ہی راہ پر گامزن لوگوں کے ایک گروہ کا سختی کے ساتھ پس میں متصل ہونا۔ یہ لوگ ایک ہی منزل کی جانب گامزن ہوتے ہیں اور ایک ہی فکر اور ایک ہی عقیدے کو ماننے والے ہوتے ہیں۔

اس صف سے تعلق رکھنے والے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ متصل ہونا چاہیئے۔ انہیں چاہیئے کہ دوسری صف بندیوں، دوسرے مراکز اور دوسرے عناصر سے اپنے آپ کو جدا اور علیحدہ رکھیں۔

کیوں؟

اس لئے، تا کہ ان کا خاتمہ نہ ہو جائے، وہ دوسروں میں تحلیل نہ ہو جائیں۔

اس چیز کو قرآن کریم میں ولایت کہتے ہیں۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے اوّلین گروہ کو اس طرح پیوستہ اور متصل کرتے ہیں، انہیں ایک دوسرے سے جوڑتے ہیں، انہیں ایک دوسرے کا بھائی بناتے ہیں، انہیں ایک جسمِ واحد کی صورت میں ڈھالتے ہیں، ان کے ذریعے امتِ اسلامی تشکیل دیتے ہیں اور اسلامی معاشرہ وجود میں لاتے ہیں۔

انشاء اللہ آپ آگے چل کر آیت قرآنی میں دیکھیں گے کہ پیغمبرؐ صدرِ اسلام کے مسلمانوں کے اس اتحاد اور یکجہتی کے ذریعے دشمنوں، معاندوں اور مخالفوں کا راستہ روکتے ہیں،

اپنے تیار کردہ اس گروہ کو معاشرے میں موجود دوسرے گروہوں سے جدا کرتے ہیں۔ انہیں یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین کے گروہ کے ساتھ مل جانے سے روکتے ہیں اور ان کی صفوں کو باہم منسلک اور متصل رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اسلئے کہ اگر یہ مسلمان اس حالت میں نہ ہوں، اگر ان کے درمیان ولایت نہ پائی جائے، اگر یہ سو فیصد ایک دوسرے سے پیوست نہ ہوں اور ان کے درمیان اختلاف وجود میں جائے، تو یہ اپنے کاندھوں پر پڑنے والی امانت کے اس بوجھ کو اٹھانے سے قاصر رہیں گے اور اس بارِگراں کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکیں گے۔

بعد میں بھی جب اسلامی معاشرہ ایک عظیم اُمت میں تبدیل ہوجاتا ہے، تب بھی ولایت کی ضرورت رہتی ہے۔

ایک امت کے لئے کس طرح کی ولایت ضروری ہے، اور کس لئے یہ لازم ہے، اسکی وضاحت ہم بعد میں کریں گے۔ لیکن اگر ہم یہیں ٹھہر کر کچھ غور کریں، تو وہ ولایت جس کا ذکر شیعہ کرتے ہیں اس کا کچھ مفہوم ہم پر واضح ہوجائے گا۔

ظلمت سے بھری ایک دنیا میں، ایک جاہل سماج میں، ایک چھوٹے سے گروہ کو اپنی بقا کے لئے باہم مربوط اور متصل رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ گروہ باہم پیوست اور جڑا ہوا نہ ہو، تو اس کا باقی رہنا اور اپنی زندگی جاری رکھنا محال ہے۔ ہم نے مثال کے طور پر مکہ کے جاہل معاشرے میں اسلام کے ابتدائی دور کے مسلمانوں کے گروہ، یا پہلے پہل مدینہ میں نئے والے مسلمانوں کے گروہ کا ذکر کیا۔ اسکی دوسری مثال اسلامی تاریخ کے آغاز میں شیعہ مخالف اور اسلام مخالف خلافتوں کے زمانے میں شیعوں کا چھوٹا سا گروہ ہے۔

کیا شیعہ آسانی کے ساتھ باقی رہ سکتے تھے؟

کیا پروپیگنڈے کے حربے، پابندیاں، قید خانے، اذیتیں اور قتل و غارت اس بات کی اجازت دیتے تھے کہ یہ گروہ باقی رہ سکے؟

اور وہ بھی شیعوں کی مانند ایک فکری گروہ، جو اپنے زمانے کی حکومتوں کا بھرپور مخالف اور اُن کے لئے دردِ سر تھا۔

لیکن اسکے باوجود یہ گروہ کیسے باقی رہ گیا؟

اس لئے باقی رہ گیا کہ ولایت نے شیعوں کے درمیان ایک حیرت انگیز پیوستگی اور شیرازہ بندی پیدا کر دی تھی، تا کہ اس ولایت کے زیرِ سایہ شیعی تحریک وہاں پائی جانے والی دوسری طرح طرح کی تحریکوں کے درمیان محفوظ رہ سکے۔

آپ ایک بہت بڑے دریا کا تصور کریں جس میں کئی اطراف سے مختلف پانی داخل ہو رہے ہیں۔ یہ پانی تیز رفتاری کے ساتھ حرکت میں ہیں اور دریا کی سطح متلاطم ہے، اس پر گرداب وجود میں رہے ہیں، پانی پس میں پیچ وخم کھا رہے ہیں، ایک دوسرے سے مختلف طرح طرح کے پانی اس دریا میں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کو تحلیل کر رہے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور دریا آگے بڑھ رہا ہے۔

اِن لودہ اور گدلے پانیوں کے درمیان میٹھے، صاف، لطیف اور شفاف پانی کا ایک دھارا بھی رواں دواں ہے، جو اس بہاؤ میں ایک عجیب انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ پانی محفوظ اور سلامت ہے، اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کسی صورت اس کا رنگ خراب نہیں ہوتا، یہ کسی صورت دوسرے پانیوں کی تلخی اور کھارا پن اختیار نہیں کرتا، اپنے اُسی میٹھے ذائقے، اُسی شفاف رنگت اور اُسی خالص پن کو محفوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

آپ اُموی اور عباسی دور کے عالمِ اسلام کو اس دریا سے تشبیہ دیں جس میں طرح طرح کی فکری، سیاسی اور عملی تحریکیں ایک دوسرے کے دوش بدوش چل رہی تھیں۔ آپ اوّل سے آخر تک نگاہ ڈال لیجئے، آپ تشیع کی تحریک کو دیکھیں گے کہ وہ اس عجیب طوفان کے درمیان پانی کی ایک باریک لکیر کی مانند ایک ناچیز اور معمولی شئے نظر آئے گی، لیکن اِس طرح کہ اُس نے اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہوا ہے، کسی صورت لودہ نہیں ہوئی ہے، کسی صورت اُس کا ذائقہ خراب نہیں ہوا ہے، ہرگز وہ اپنی شفافیت سے محروم نہیں ہوئی ہے، ہرگز اُس نے دوسرے پانیوں کے رنگ، بو اور ذائقے کو اختیار نہیں کیا ہے، وہ باقی رہی اور مسلسل آگے بڑھی ہے۔

لیکن وہ کیا چیز ہے جس نے اسکی حفاظت کی ہے؟

وہ کیا شئے ہے جو اس شیعی تحریک کی بقا کا سبب بنی ہے؟

وہ اس ولی کا وجود ہے جو لوگوں اور اپنے پیروکاروں کو ولایت کی تلقین کرتا ہے، انہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتا ہے، انہیں ایک دوسرے کے لئے مہربان کرتا ہے، اُن کے درمیان ولایت کی ترویج کرتا ہے اور اس صف میں موجود افراد کے اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کی حفاظت کرتا ہے۔

شیعی ولایت کا ایک پہلو یہ ہے، جس پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اسکے اور بھی پہلو ہیں، ہم اُن کا بھی جائزہ لیں گے۔

پس ولایت، یعنی باہم پیوستگی، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہونا۔

قرآن مجید مومنین کو ایک دوسرے کا ولی قرار دیتا ہے، اور سچے صاحبانِ ایمان کو ایک دوسرے سے متصل اور باہم پیوست سمجھتا ہے۔ ہماری روایات میں شیعہ کو مومن کہا جاتا ہے۔ اس تصور کی رو سے، ایمان سے مراد، ولایت پر مبنی خاص شیعی طرزِ تفکر کا حامل ہونا ہے۔ یعنی اسلام کو شیعی نکتہ نظر سے اپنانا اور جس منطق سے شیعہ اسے ثابت کرتے ہیں، اُس منطق سے اس کا

اثبات کرنا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام کے زمانے میں اس قسم کے شیعوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط، متصل اور باہم پیوست کیا گیا، انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنایا گیا، تاکہ وہ تاریخ میں شیعی تحریک کو محفوظ رکھیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا، تو شیعہ ختم ہوجاتے، ان کے افکار نابود ہوجاتے۔ جیسا کہ بعض دوسرے فرقوں کے ساتھ ایسا ہوا ہے، کہ انہوں نے اپنا رنگ کھو دیا ہے، ختم اور نابود ہو گئے ہیں۔

خدا کے ولی کی ولایت

بہرصورت یہ ولایت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ انشاءاللہ! ہم ولایت کے ایک اور پہلو سے متعلق عرض کریں گے، جو شاید ایک اور اعتبار سے اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور یہ ولی اللہ کی ولایت کا پہلو ہے۔

ہم شیعہ افراد کی باہمی ولایت کے متعلق جان چکے ہیں۔

ولی خدا کی ولایت سے کیا مراد ہے؟

علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کے کیا معنی ہیں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولایت کا کیا مطلب ہے؟ یہ جو آج ہم لوگوں کے لئے ائمہ علیہ السلام کی ولایت رکھنا ضروری ہے، اس سے کیا مراد ہے؟

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ائمہ علیہ السلام کی ولایت کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُن سے فقط محبت کریں؟

یہ لوگ کس قدر غلط فہمی کا شکار ہیں، صرف محبت کرنا ولایت نہیں ہے۔

کیا پورے عالم اسلام میں کوئی ایک فرد بھی ایسا ملے گا جو ائمہ معصومین علیہ السلام اور خاندانِ پیغمبرؐ سے محبت نہ کرتا ہو؟

پس کیا یہ سب لوگ ولایت رکھتے ہیں؟

کیا کوئی ہے جو ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا دشمن ہو؟

وہ تمام لوگ جنہوں نے ابتدائے اسلام میں اُن کے خلاف جنگ کی، کیا وہ سب کے سب اُن کے دشمن تھے؟

نہیں، ان میں سے بہت سے لوگ ائمہ علیہ السلام سے محبت کرتے تھے، لیکن دنیاوی مفادات کی خاطر اُن کے خلاف جنگ پر تیار ہوئے، باوجود یہ کہ وہ جانتے تھے کہ یہ ہستیاں کن مراتب اور کن مقامات کی مالک ہیں۔

جب (عباسی خلیفہ) منصور کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی رحلت کی خبر دی گئی، تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کیا آپ کے خیال میں وہ دکھاوا کر رہا تھا؟

کیا وہ اپنے نوکروں کے سامنے دکھاوے کا رونا رو رہا تھا؟

کیا وہ ربیع حاجب کے سامنے دکھاوا کرنا چاہتا تھا؟

یہ دکھاوا نہیں تھا، واقعاً اس کا دل دُکھا تھا، واقعاً اسے امام جعفر صادق علیہ السلام کی موت کا افسوس تھا۔

لیکن امام علیہ السلام کو کس نے مارا تھا؟

خود منصور کے حکم سے امام جعفر صادق علیہ السلام کو زہر دیا گیا تھا۔

لیکن جب اُسے بتایا گیا کہ کام ہو گیا ہے، تو اُس کا دل ہل کے رہ گیا۔

پس کیا منصور بھی ولایت رکھتا تھا؟

اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مامون عباسی شیعہ تھا۔

پتا ہے شیعہ کے کیا معنی ہیں؟

کیا ایسا شخص شیعہ کہلائے گا جو یہ جانتا ہو کہ امام رضا علیہ السلام حق بجانب ہیں؟

کیا اس کا فقط اتنا جاننا اسے شیعہ قرار دے دے گا؟

اگر ایسا ہو، تو پھر مامون عباسی، ہارون رشید، منصور، معاویہ اور یزید، یہ سب کے سب لوگ، دوسروں سے بڑھ کر شیعہ تھے۔

وہ لوگ جو جنگوں میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے خلاف لڑے، کیا اُنہیں امام علیہ السلام سے محبت نہ تھی؟

کیوں نہیں، اُن میں سے اکثر حضرت علی علیہ السلام سے محبت کرتے تھے۔

پس پھر کیا وہ شیعہ ہوئے؟

پس کیا وہ ولایت رکھتے تھے؟

نہیں، ولایت ان باتوں سے ہٹ کر ہے۔ ولایت ان چیزوں سے بالاتر ہے۔

جب ہم ولایتِ علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور ولایتِ ائمہ علیہم السلام کو سمجھ لیں، اور یہ جان لیں کہ ولایت کیا ہے؟، تو پھر ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی طرف پلٹیں، اور دیکھیں کہ کیا واقعاً ہم ولایت رکھتے ہیں؟

اُس موقع پر اگر دیکھیں کہ ہم ولایت نہیں رکھتے، تو پھر ہمیں ولایتِ ائمہ علیہ السلام کے حصول کے لئے خدا سے دعا کرنی چاہیئے اور اس سلسلے میں کوشش کرنی چاہیئے۔

کچھ لوگ اپنے دل میں ائمہ اطہار علیہ السلام کی محبت اور عقیدت رکھنے کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اُن میں ولایتِ اہل بیت علیہ السلام پائی جاتی ہے۔

نہیں، یہ ولایت نہیں ہے۔ ولایت اس سے بالاتر ہے۔

البتہ ہم آگے چل کراس بات کی وضاحت کریں گے کہ ولایتِ ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے کیا مراد ہے۔کس طرح ہم ائمہ علیہم السلام کو اپنا ولی قرار دے سکتے ہیں، اوراُن کی ولایت کے حامل بن سکتے ہیں۔اس وضاحت کے بعد ہم سمجھ پائیں گے کہ ائمہ علیہم السلام کی ولایت کے سلسلے میں ہمارا دعویٰ کس قدر لاعلمی پر مبنی اور خلافِ حقیقت ہے۔

عیدِغدیر کے ایام میں لوگ یہ دعا پڑھتے ہیں:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی جَعَلَنَا مِنَ الْمُتَمَسِّكِینَ بِوِلَایَةِ أَمِیرِ الْمُؤْمِنِین۔"[1]

ہم اکثر اپنے دوستوں سے کہتے ہیں کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَنَا"نہ کہیے۔ممکن ہے ہمارا یہ کہنا جھوٹ ہو، بلکہ یہ کہیے کہ:

اَللّٰھُمَّ اللهِ جْعَلْنَا مِنَ الْمُتَمَسِّکِینَ بِوِلَایَةِ عَلِیّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ علیہ السلام۔

بارِالٰہا!ہمیں ولایت سے وابستہ لوگوں میں سے قرار دے۔

کیونکہ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم ولایت سے وابستہ ہیں بھی یا نہیں؟

انشاءاللہ ہمارے سامنے یہ نکتہ واضح ہوجائے گا کہ یہ بھی ولایت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔

ہماری آج کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ کی ولایت اور خدا اور راہِ خدا کے لئے کوشاں گروہ کی ولایت کے معنی یہ ہیں کہ اس گروہ میں موجود افراد کے درمیان زیادہ سے زیادہ قربت اور اتصال وجود میں ئے،اُن کے دل زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور نزدیک ہوں، اور یہ لوگ اپنے مخالف مراکز سے، ایسے لوگوں سے جن کی سوچ اُن کے

---

[1] الإقبال بالأعمال الحسنة (ط-الحديثة)/ج2/261/فصل(6) فيما نذكره من فضل يوم الغدير من كتاب النشر والطی..... ص: 260

خلاف ہو، اور جو اُن کے برخلاف عمل کرتے ہوں، حتیٰ الامکان دور ہوں۔

یہ ہیں ولایت کے معنی۔

سورہ ممتحنہ کی ابتدائی آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا ہمارے خیال میں اس موضوع کی مناسبت سے اس سورے کا نام سورہ ولایت رکھا جا سکتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ.

اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمن کو اپنا ایسا (جگری) دوست نہ بناؤ کہ ان سے محبت کا اظہار کرنے لگو۔

بعض ترجموں میں ہے کہ میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بنانا۔ یہ اس کے مکمل معنی نہیں ہیں۔ فقط دوستی اور محبت کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مسئلہ اس سے بالاتر ہے۔ اپنا ولی نہ بناؤ، یعنی اُنہیں اپنے گروہ کا حصہ نہ سمجھو، اپنے آپ کو اُن کی صف میں کھڑا نہ کرو۔ یعنی اپنے آپ کو اور اُنہیں ایک ہی صف میں تصور نہ کرو۔ ایک ایسا شخص جو خدا کا اور تمہارا دشمن ہے اُسے اپنے پہلو میں جگہ نہ دو، بلکہ اسے اپنا مدِمقابل اور اپنا دشمن اور حریف سمجھو:

تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ

اُنہیں اپنی صفوں میں شامل نہ سمجھو کہ اُنہیں دوستی کے پیغام بھیجنے لگو۔

وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ

جبکہ تم اس بات سے واقف ہو کہ انہوں نے اس حق وحقیقت سے انکار کیا ہے جسے پروردگار نے تمہارے لئے نازل کیا ہے۔

يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ

یہ لوگ پیغمبر کو اور تمہیں تمہارے وطن سے باہر نکال رہے ہیں۔

اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّكُمۡ ؕ

صرف اس جرم میں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اِنۡ كُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِهَادًا فِىۡ سَبِيۡلِىۡ وَابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِىۡ‌ ۖ

اگر تم ہماری راہ میں جہاد اور ہماری خوشنودی کے حصول کے لئے نکلے ہو، تو

میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

اگر واقعاً تم سچ کہتے ہو، اور میری راہ میں جہاد اور کوشش کرتے ہو، تو تمہیں حق نہیں پہنچتا کہ میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنی صفوں میں جگہ دو، اور اُنہیں اپنا مددگار اور ساتھی بناؤ۔

البتہ بعد کی آیت واضح کرتی ہیں کہ خدا کی مراد کون سے کفار ہیں، اور ان آیات میں کفار کو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

تُسِرُّوۡنَ اِلَيۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ‌ ۖ

تم ان کے ساتھ خفیہ اور پوشیدہ طور پر محبت کرتے ہو۔

وَاَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَيۡتُمۡ وَمَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ‌ ؕ

اور جو کچھ تم خفیہ اور علانیہ کرتے ہو میں اُس سب سے باخبر ہوں۔

وَمَنۡ يَّفۡعَلۡهُ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ [1]

اور تم میں سے جو کوئی دشمنانِ خدا کی طرف دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھائے گا اور اپنے آپ کو ان کی صف میں سمجھے اور ظاہر کرے گا، وہ راہِ اعتدال سے بھٹک گیا ہے۔

اس بات کا ذکر کر دینا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ان آیات کی شانِ نزول" حاطب بن

---

[1] سورۂ ممتحنہ:۱

ابی بلتعہ" کے بارے میں ہے۔ حاطب بن ابی بلتعہ ایک کمزور ایمان مسلمان تھا، جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفارِ قریش کے خلاف جنگ کا ارادہ کیا، تو حاطب نے سوچا کہ ممکن ہے پیغمبر کو اس جنگ میں شکست ہوجائے اور اس کے اعزہ واقربا جو وہاں کفار میں رہ رہے ہیں، اُنہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔ جبکہ وہ خود پیغمبرؐ کے سپاہیوں میں شامل ہے۔ اس نے ایک چالاکی کرنی چاہی۔ اس نے سوچا کہ اب جبکہ میں پیغمبرؐ کے ساتھ ہوں، اُن کی رکاب میں جہاد کررہا ہوں، اور راہِ خدا کے مجاہدین کا ثواب کمارہا ہوں، تو کیوں نہ احتیاطاً کفار کے نام بھی ایک خط لکھ دوں، اور اُن سے اپنی محبت اور وفاداری کا اظہار کروں۔ کیا مضائقہ ہے؟ جب میرا میدانِ جنگ میں اُن سے سامنا ہوگا، تو اس خط پر عمل نہیں کروں گا۔ لیکن کیا حرج ہے کہ میں ایک خط لکھ کر کفار کے دل میں اپنے لئے نرم گوشہ پیدا کرلوں اور ان کی ہمدردی حاصل کرلوں؟ خدا بھی خوش ہوجائے اور میرے کسی مفاد پر بھی ضرب نہ لگے۔

کہتے ہیں ایک بڑے آدمی اور علاقے کے چودھری کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ دیکھنے والوں میں سے کسی نے ایک شخص سے پوچھا: اِن میں سے کون حق بجانب ہے؟

اُس نے کہا: دونوں ہی حق بجانب ہیں، دونوں ہی سے بنا کے رکھنی چاہیئے!

لہٰذا حاطب نے قریش کے سرداروں کے نام ایک خط لکھا اور اس پر اپنے دستخط بھی کردیئے۔ تاکہ ان کے علم میں آجائے کہ حاطب اُن کا خیرخواہ، دوست اور مہربان ہے۔ پھر اُس نے اس خط کو ایک عورت کے توسط سے مکہ بھیج دیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس قصے کا علم ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور ایک یا دو دوسرے افراد کو روانہ کیا اور انہوں نے راستے میں اس عورت کو ڈھونڈ نکالا۔ ان لوگوں نے اسے ڈرا دھمکا کر اس سے یہ کاغذ برآمد کرلیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاطب سے پوچھا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں تم دشمن کے

سامنے جنگی اور فوجی راز افشا کر رہے تھے؟ اس نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! وہاں میرے کچھ دوست اور ساتھی ہیں، عزیز رشتے دار ہیں، مجھے خوف ہوا کہ کہیں انہیں کوئی مشکل نہ اٹھانی پڑے۔لہٰذا میں نے یہ خط لکھ کر مشرکین کے دل میں اپنے لئے نرم گوشہ پیدا کرنا چاہا تھا۔

جواب میں آیت کہتی ہے: غلط فہمی کا شکار نہ رہو، ان کے دل تمہارے لئے نرم نہیں ہوں گے۔ جو لوگ فکری لحاظ سے تمہارے مخالف ہیں۔ وہ لوگ جن کے لئے تمہارا دین، تمہارا ایمان ضرر رساں ہے، اُنہوں نے تمہارے دین اور تمہارے ایمان کو نابود کرنے پر کمر باندھی ہوئی ہے۔ وہ کسی صورت تمہارے لئے مہربان اور تمہارے دوست نہیں ہوں گے۔

بعد والی آیت اس نکتے کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:

اِنۡ یَّثۡقَفُوۡکُمۡ یَکُوۡنُوۡا لَکُمۡ اَعۡدَآءً

یہ اگر تم پر قابو پالیں، تو تمہارے دشمن ثابت ہوں گے۔

اے ”حاطب بن ابی بلتعہ“ یہ نہ سمجھنا کہ اگر تم نے ان کی مدد کی، تو کل وہ تمہارا کچھ لحاظ کریں گے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اگر تم نے ان کی مدد کی، تو یہ اور زیادہ تم پر مسلط ہو جائیں گے، تم پر مزید ظلم و ستم کے پہاڑ توڑیں گے۔

وَیَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡکُمۡ اَیۡدِیَہُمۡ وَ اَلۡسِنَتَہُمۡ بِالسُّوۡٓءِ

اور اپنے ہاتھ اور زبان کو تمہارے خلاف استعمال کریں گے۔

تمہیں اور زیادہ دبائیں گے، تمہاری تذلیل کریں گے، تمہیں بے حیثیت اور بے عزت کریں گے، تمہیں ایک انسان نہیں سمجھیں گے۔

یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری یہ مدد تمہارے کسی کا م آئے گی۔

وَوَدُّوۡا لَوۡ تَکۡفُرُوۡنَ۔[1]

---

[1] سورۂ ممتحنہ:۲

یہ چاہیں گے کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔

اگر کل یہ تم پر مسلط ہو گئے، تو تمہیں ذرّہ برابر ایمانِ قلبی تک رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ (یہ تو چاہتے ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ) یہ نہ سمجھنا کہ یہ تمہیں مسلمان رہنے اور اسلامی فرائض پر عمل کرنے کے لئے زاد چھوڑ دیں گے۔

بعد والی آیت "حاطب بن ابی بلتعہ" کے عزیز و اقارب اور تاریخ کے تمام حاطب بن ابی بلتعوں" کے عزیز و اقارب کے بارے میں ہے۔ ایک دوٹوک جملے میں کہتی ہے کہ تم اپنے بچوں کے لئے، اپنے عزیز و اقارب کے لئے اور اپنے رشتے داروں کی آسائش کے لئے خدا کے دشمن کے ساتھ ساز باز پر تیار ہو، اور خدا کے ناچیز بندوں کی محبت حاصل کرنے کے لئے اور اپنے اور اپنے اعزہ کے مفادات کے حصول کے لئے حکمِ خدا کو نظر انداز کر رہے ہو اور خدا کے دشمن سے دوستی کر رہے ہو۔

آخر یہ اعزہ و اقربا اور اولاد تمہارے کتنے کام آئیں گے؟

یہ جوان جس کے روزگار کے لئے تم کفارِ قریش کے ساتھ ساز باز پر آمادہ ہو، تمہارے کتنے کام آئے گا؟

کیا وہ تمہیں عذابِ خدا سے نجات دلا سکے گا؟

یہ بے خبر "حاطب" اپنے اعزہ، احباب اور رشتے داروں کو نقصان سے بچانے کے لئے کفار اور دشمنانِ پیغمبرؐ سے ساز باز کر رہا تھا۔

آخر یہ اعزہ اور اولاد، انسان کے کتنے کام سکتے ہیں، کہ انسان ان کی خاطر پروردگار عالم کے عذاب اور اسکے غضب کو دعوت دے؟

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ

تمہارے رشتے دار، اعزہ اور اولاد تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔

يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۚ يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡ ؕ

روزِ قیامت تمہارے اوران کے درمیان جدائی ڈال دے گا۔

یا اسے اس طرح پڑھیں اور اسکے یہ معنی کریں کہ:

لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ ۚ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۚ

روزِ قیامت تمہارے رشتے دار اور اولاد تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔

يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡ ؕ [1]

خدا روزِ قیامت تمہارے اور اُن کے درمیان جدائی ڈال دے گا۔

جیسے کہ خداوندِ عالم سورہ عبس میں فرماتا ہے:

يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيۡهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيۡهِ ﴿۳۶﴾

"جس دن انسان اپنے بھائی، اپنے والدین، اپنی مہربان زوجہ اور اپنی نورِ چشم اولاد سے گریز کرے گا۔" [2]

وہی بچے، جن کی خاطر آج تم اس قدر فکرمند ہو، جان لو کہ روزِ قیامت تم اُن سے دور بھاگو گے، اور وہ تم سے دور بھاگیں گے، اور یہ دونوں ہی دوسرے انسانوں سے دور بھاگیں گے، ہر انسان دوسرے انسان سے دور بھاگے گا۔ ان کے پاس ایک دوسرے کی مدد اور ایک دوسرے کی احوال پرسی کا یارانہ ہوگا:

لِكُلِّ امۡرِیٴٍ مِّنۡهُمۡ يَوۡمَئِذٍ شَاۡنٌ يُّغۡنِيۡهِ ﴿۳۷﴾

"اس دن ہر ایک کو اپنی ایسی پڑی ہوگی کہ کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔" [3]

---

[1] سورۂ ممتحنہ: ۳

[2] سورہ عبس ۸۰۔ آیت ۳۴ تا ۳۶

[3] سورہ عبس ۸۰۔ آیت ۳۷

وہ لوگ جو اپنی ل اولاد کے رام وسائش کی خاطر دنیا اورخرت کی کامیابی اور فلاح سے منھ موڑ لینے، اور بدبختیاں، شقاوتیں اور عداوتیں مول لینے پر تیار ہیں، اُنہیں قرآن مجید کی اس منطق سے گاہ ہونا چاہیۓ، شاید وہ ہوش میں جائیں۔

سورۂ ممتحنہ میں بھی خداوندِ عالم فرماتا ہے:

لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ‌ ۚ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۚ يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ‏.[۱]

"اے مومنین! یہ بات جان لو کہ روزِ قیامت تمہارے رشتے دار اور تمہاری اولاد تمہارے کسی کام نہ آئے گی، اور روزِ قیامت تمہارے درمیان مکمل جدائی ڈال دے گا، اور تم جو کچھ کرتے ہو خدا اس سے خوب باخبر ہے۔"

قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ ۚ [۲]

ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ: اے مومنین! تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں میں بہترین نمونہ عمل ہے۔

دیکھو کہ ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں اور پیروکاروں نے کیا کیا؟

تم بھی وہی کرو۔

اُنہوں نے کیا کیا تھا؟

اُنہوں نے اپنے زمانے کی گمراہ قوم اور اپنے زمانے کے طاغوت اور جھوٹے معبود سے کہا تھا کہ ہم تم سے اور تمہارے خداؤں سے بیزار ہیں، ہم تمہارے منکر ہیں اور تم سے منھ موڑتے ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ بغض، دشمنی، کینہ اور عداوت برقرار رہے گی:

---

[۱] سورہ ممتحنہ: ۳

[۲] سورہ ممتحنہ: ۴

حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ

ہمارے اور تمہارے درمیان دوستی اور صلح وشتی کا صرف ایک راستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ آؤ اور ہمارا عقیدہ قبول کرلو۔

یہاں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اے مومنین تم بھی ابراہیم علیہ السلام کی مانند عمل کرو۔

قَدۡ كَانَتۡ لَـكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ‌ ۚ

بے شک تمہارے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ عمل ہے۔

اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ ۚ

جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ہر اُس چیز سے بیزار ہیں جس کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو۔

كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَبَدَا بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا

ہم نے تم سے کفر کیا ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان بغض اور عداوت ظاہر ہو چکی ہے۔

حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ

جب تک تم خدا آئے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔

اِلَّا قَوۡلَ اِبۡرٰهِيۡمَ لِاَبِيۡهِ [1]

صرف ایک استثنائی معاملہ ایسا ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کفار سے مکمل طور سے رابطہ منقطع نہیں کیا، اور وہ معاملہ یہ ہے کہ جب انہوں نے اپنے چچا سے کہا:

لَاَسۡتَغۡفِرَنَّ لَكَ

---

[1] یہاں "اَب" کے معنی باپ نہیں، بلکہ چچا ہیں، اور یہاں "اَب" سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا، یا اُن کی والدہ کے شوہر ہیں۔ بہر حال اُس شخص سے خطاب ہے جس کا نام آزر تھا۔

میں تمہارے لئے استغفار کروں گا۔

وَمَآ اَمۡلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ شَيۡءٍ ؕ

اور تمہارے دفاع کے لئے خدائے متعال کی جانب سے میرے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔

یعنی انہوں نے اپنے والد سے کہا: یہ خیال نہ کیجئے گا کہ میں کیونکہ اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتا ہوں، لہٰذا آپ میرے والد ہونے کے ناطے، میرے توسط سے بہشت میں داخل ہوجائیں گے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے، میں آپ کو جنت میں نہیں لے جاسکتا۔ میں آپ کے لئے درگاہِ الٰہی میں فقط دعا اور استغفار کرسکتا ہوں، تا کہ خدا آپ کے گناہوں کو بخش دے اور آپ مومن ہوجائیں۔

رَبَّنَا عَلَيۡكَ تَوَكَّلۡنَا وَاِلَيۡكَ اَنَبۡنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ۝٤ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَاغۡفِرۡ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ. [1]

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں ہیں۔

اسکے بعد قرآن مجید کہتا ہے:

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِيۡهِمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ

تم مومنین کے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ عمل موجود ہے

لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ ؕ

اُن لوگوں کے لئے جو خدا اور روزِ قیامت کی امید رکھتے ہیں۔

وَمَنۡ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِيُّ الۡحَمِيۡدُ

---

[1] سورہ ممتحنہ ٦٠۔ آیت ٤، ٥

اور جو کوئی روگردانی کرے، اور اسکے حکم سے منھ پھیرے اور بے توجہی کا مظاہرہ کرے، تو خدائے متعال بے نیاز اور قابلِ حمد وثنا ہے اور اسکے دامنِ کبریائی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔

اگر تم دشمنوں سے ساز باز کرو گے، تو تمہارے شرف وانسانیت کا دامن داغدار ہو جائے گا اور خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے اس جملے کو ذہن نشین رکھنا چاہیۓ۔ ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں نے اپنے زمانے کے کفار اور گمراہ لوگوں سے کہا تھا کہ:

اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ [۱]

میں تم سے بیزار ہوں۔

امام سجاد علیہ السلام اور اُن کے اصحاب صلوات اللہ علیہم اپنے زمانے کے گمراہ لوگوں سے اسی طرح گفتگو کیا کرتے تھے۔ بحار الانوار میں ایک حدیث ہے، جو کہتی ہے: چوتھے امام (امام زین العابدین علیہ السلام) کے ایک ساتھی "یحییٰ ابن ام طویل" مسجدِ نبوی میں آتے اور لوگوں کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جاتے۔ اُنہی لوگوں کے سامنے جو بظاہر خاندنِ پیغمبر علیہ السلام کے محب تھے، اُنہی لوگوں کے روبرو جن کے درمیان امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام نے بیس برس تک زندگی بسر کی تھی، اُنہی لوگوں کے مقابل جو نہ اُموی تھے اور نہ بنی امیہ سے وابستہ افراد تھے۔

پھر یہ کیسے لوگ تھے؟

بزدل لوگ تھے، جنہوں نے بنی امیہ کی بنائی ہوئی خوف اور گھٹن کی فضا سے ڈر کر واقعہ عاشورا اور کربلا میں لِ محمد علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، لیکن اپنے دلوں میں اہل بیت علیہ السلام سے محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

---

[۱] سورۂ انفال:۴۸

یحییٰ ابن ام طویل، اس قسم کے لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور اس قرآنی کلام کو دُھرایا کرتے:

كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ

ہم نے تم سے منھ پھیر لیا ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان بغض اور عداوت ظاہر ہو چکی ہے۔

یعنی وہی بات کہتے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانے کے کفار، مشرکین، گمراہ اور منحرف لوگوں سے کہا کرتے تھے۔

دیکھئے ولایت وہی ولایت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ولایت رکھتے تھے، امام سجاد علیہ السلام کے شیعہ بھی اپنے زمانے میں ولایت رکھتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے مل کر اور دشمنوں سے جدا رہنا چاہیئے۔ اگر امام سجاد علیہ السلام کے شیعوں میں سے کوئی شیعہ ان کے زمانے میں خوف کی وجہ سے یا لالچ کی وجہ سے دشمن کی صف میں شامل ہوا، تو وہ امام سجاد علیہ السلام کی ولایت سے خارج ہو گیا۔ اب وہ امام سجاد علیہ السلام کے گروہ میں شامل نہیں ہے۔ لہٰذا امام سجاد علیہ السلام کا قریبی شاگرد اس شخص سے کہتا ہے:

كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ

”ہم نے تم سے منھ پھیر لیا ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان بغض اور عداوت ظاہر ہو چکی ہے۔“

یحییٰ ابن ام طویل کا شمار امام سجاد علیہ السلام کے بلند پایہ اور انتہائی بہترین اصحاب میں ہوتا تھا۔ اس بلند پایہ مسلمان کا انجام یہ ہوا کہ حجاج بن یوسف نے انہیں گرفتار کر لیا، اُن کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا، اُن کا بایاں ہاتھ کاٹ ڈالا۔ اُن کے بائیں پیر کو قطع کر دیا، اُن کے دائیں پیر کو جدا کر ڈالا۔ لیکن اسکے باوجود انھوں نے اپنی زبان سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُن کی زبان بھی

کٹوادی گئی، یہاں تک کہ وہ دنیا سے رحلت فرما گئے۔اس حال میں بھی انہوں نے شیعوں کی تنظیم کی،امام سجاد علیہ السلام کے بعد شیعیت کے محل کی تعمیر کی اور اُسے مضبوط اور مستحکم کیا۔

امتِ اسلامیہ کے باہمی تعلقات

اندرونی اور بیرونی تعلقات

اسلامی معاشرہ اور وہ سماج جو امتِ اسلامی کے طور پر تشکیل دیا گیا ہے، اور جسے احکامِ الٰہی اور الٰہی افکار کی بنیاد پر خدا کی معین کردہ مقتدر قوت (authority) کے توسط سے قانون سازی اور ان قوانین کے اجرا و نفاذ کے ذریعے چلایا جاتا ہے، اگر یہ امتِ اسلامی اُس قرآنی معنی میں ولایت کی حامل ہونا چاہے اور اپنے لئے اس کا بندوبست کرنا چاہے جس کا ذکر ہم نے اس سے پہلے والی تقریر میں کیا ہے، تو اس پر لازم ہے کہ وہ دو پہلوؤں کا خیال رکھے۔ ایک پہلو اسلامی معاشرے کے اندرونی روابط ہیں، اور دوسرا پہلو اس کے بیرونی روابط۔ یعنی عالمِ اسلام اور اسلامی معاشرے کے دوسرے معاشروں اور دوسری اقوام سے روابط وتعلقات۔

اندرونی تعلقات اور روابط کے حوالے سے (عرض ہے کہ) امتِ اسلامیہ اُس وقت قرآنی معنی کے اعتبار سے ولایت کی حامل ہوگی جب اُس کی صفیں پس میں پیوست، متصل اور جڑی ہوئی ہوں اور اُس کے مختلف ارکان اور گروہوں کے درمیان مکمل اتحاد و اتفاق پایا جاتا ہو، پوری امتِ اسلامیہ میں کوئی تفرقہ اور اختلاف موجود نہ ہو، اور اس کے اندر مختلف صف بندیاں نہ پائی جاتی ہوں۔

اگر امتِ اسلامیہ کے اندر دو دھڑے ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہوں، تو قرآنی حکم یہ ہے کہ بقیہ مسلمانوں کو ان دو دشمنوں اور باہم برسرِ جنگ گروہوں کے درمیان صلح وآشتی کے قیام کی حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہیئے۔

اگر وہ دیکھیں کہ ان دو متحارب گروہوں میں سے ایک صلح وآشتی پر مادہ ہے، لیکن دوسرا اس پر تیار نہیں، یا اُن میں سے ایک کی بات ناحق ہے، جبکہ دوسرا حق بجانب ہے، اور جس گروہ کی بات ناحق ہے وہ حق بات تسلیم کرنے پر تیار نہیں، تو اس موقع پر تمام عالم اسلام کو چاہیئے کہ وہ اس ظالم گروہ کے خلاف یکجا ہو جائے، اُس سے جنگ کرے، یہاں تک کہ وہ گھٹنے ٹیک دے۔

سورۂ حجرات کی نویں آیت میں خداوندِ عالم کا ارشاد ہے:

وَإِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ

اگر مسلمانوں کے دو گروہ پس میں جھگڑ پڑیں، تو تم ان کے درمیان صلاح کراؤ۔

فَإِنْۢ بَغَتْ إِحْدٰىهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ

اگر ان دو گروہوں میں سے ایک گروہ نے دوسرے پر ظلم کیا ہو یعنی جارحیت اور ظلم روا رکھا ہو، بدمعاشی کرنا چاہی ہو، زور زبردستی کرنا چاہتا ہو، تو اسکے خلاف جنگ کرو۔

حَتّٰى تَفِيْٓءَ إِلٰٓى أَمْرِ اللّٰهِ ۚ

یہاں تک کہ وہ فرمانِ خدا کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو جائے۔

حکم خدا قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔

خداوند عالم کا یہ حکم اسلامی معاشرے کے اندر اتحاد واتفاق کی حفاظت کے لئے ہے۔

بیرونی روابط کے حوالے سے (عرض ہے کہ) امتِ اسلامیہ کو غیر مسلم دنیا اور اپنی امت سے باہر کے لوگوں کے ساتھ اپنے روابط اور تعلقات کو اس طرح ترتیب دینا چاہیئے کہ امتِ اسلامیہ ذرّہ برابر اُن کے زیرِ کنٹرول اور اُن کے افکار کے زیرِ اثر نہ ہو اور اُن کی سیاست کی

معمولی سی بھی تاثیر قبول کر کے اپنی خودمختاری سے دستبردار نہ ہو۔

مسلمانوں کا ایک قوم کی حیثیت سے اُن کے ساتھ ایک کیمپ میں شامل ہونا اور اُن سے پیوست ہوجانا قطعاً ممنوع ہے۔

ایک معروف داستان ہے جس کا ذکر قابلِ اعتبار شیعہ کتب میں یا ہے، اور جو امام جعفر صادق یا امام محمد باقر علیہما السلام کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس زمانے میں عالمِ اسلام کا سکّہ (coin) روم میں ڈھلتا تھا۔ اس سلسلے میں روم نے کوئی دھمکی دی جس سے مسلمانوں کے لئے ایک مشکل کھڑی ہوگئی۔ اس موقع پر امام علیہ السلام نے خلیفہ وقت کی رہنمائی کی۔ عجیب بات ہے۔ ہماری نظر سے فقط ایک، دو انتہائی استثنائی مواقع ہی ایسے گزرے ہیں جن میں ائمہ ہدیٰ نے حکام کے ساتھ کچھ خوش روئی کا مظاہرہ کیا ہو۔ اُن میں سے ایک یہ مقام ہے کہ جہاں امام علیہ السلام نے حکام کی رہنمائی کی اور فرمایا کہ اس طرح سے (اپنا) سکہ ڈھالو۔ کیونکہ وہ لوگ چاندی کے سکّے کی ڈھلائی کا طریقہ نہیں جانتے تھے۔

لٰہذا بیرونی روابط کے میدان میں، غیر اسلامی گروہوں، بالخصوص اسلام دشمنوں کی ذرّہ برابر تاثیر قبول کرنا بھی ممنوع ہے۔ اسلامی معاشرے اور امتِ اسلامیہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ غیر مسلم دنیا سے اس پر بالا دستی کے سوا کسی اور صورت سے روابط برقرار کریں۔ یعنی اگر ایسا ہو کہ امتِ اسلامیہ اور ایک غیر اسلامی حکومت کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم کیا جائے جس میں امتِ اسلامیہ استحصال کا شکار ہو، جیسے تمباکو والے واقعے میں ہوا تھا، جسے آپ سب نے سن اور پڑھ رکھا ہے، تو عالمِ اسلام کو ایسے کسی تعلق کے قیام کا حق حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے سلاطین اور مغل حکمرانوں نے بیرونی ممالک کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ وہاں آئیں اور اپنی کمپنیاں قائم کریں۔ یہ ناجائز اور عالمِ اسلام کی ولایت کے برخلاف عمل ہے۔ انہیں یہ بات جاننی چاہئے تھی، اور سب کو جاننا چاہئے کہ جب ایسٹ انڈیا جیسی کمپنیاں اُن کی سرزمین میں داخل

ہوں گی، تو وہ وہاں کے رہنے والوں پر کیا کیا بلائیں نازل کریں گی اور اس عظیم براعظم کی رگ وپے میں استعمار کو کس قدر نفوذ بخشیں گی۔ عالمِ اسلام اور امتِ اسلامیہ کو کسی صورت اس قسم کے روابط اور تعلقات کے قیام کی اجازت نہیں دی گئی۔

یہ بات پیشِ نظر رہے، کہ جب ہم غیر مسلم حکومتوں اور غیر مسلم اقوام کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی بات کرتے ہیں، تو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ عالمِ اسلام اور امتِ اسلامیہ سیاسی طور پر دنیا سے الگ تھلک ہو جائے۔ یہ سیاسی گوشہ نشینی کا مسئلہ نہیں ہے۔ کہیں آپ یہ خیال نہ کریں کہ عالمِ اسلام کو نہ کسی سے تجارتی تعلقات رکھنے چاہئیں، نہ سیاسی روابط اور نہ سفارتی تعلقات، نہ اُسے کہیں اپنے سفیر بھیجنے چاہئیں، نہ کسی کے سفیر قبول کرنے چاہئیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ اُسے دوسروں کے ساتھ معمول کے تعلقات رکھنے چاہئیں، لیکن اُن کے ساتھ ولایت نہیں رکھنی چاہیے، اُن کے ساتھ وابستہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اُن کے ساتھ کوئی ایسا تعلق نہیں رکھنا چاہیے جس کی وجہ سے وہ جب چاہیں عالمِ اسلام کو اپنے زیر اثر لے سکیں۔

پس قرآنی ولایت کے دو مظہر ہیں۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر تمام عناصر ایک مقصد، ایک سمت اور ایک راہ پر گامزن ہوں، اور دوسرا یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ اسلامی معاشرے سے باہر تمام اسلام مخالف عناصر اور گروہوں سے اپنا رشتہ توڑ لے۔

اس مقام پر ایک انتہائی باریک نکتہ موجود ہے، جو بتاتا ہے کہ لفظ ولایت کے قرآنی مفہوم کی رو سے ولایت کا مفہوم وہی ہے جس کے شیعہ قائل ہیں۔

یہ جو شیعیت میں امام کے ساتھ تعلق کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے، یہ جو ہم امام کے فرمان کو معاشرتی زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ سمجھتے ہیں، یہ کس مقصد کے لئے ہے اور اسکی بنیاد کیا ہے؟

یہاں قرآن کریم ہم سے کہتا ہے کہ اگر ایک معاشرہ اور ایک امت اس مفہوم میں

قرآنی ولایت کی حامل ہونا چاہتی ہو، یعنی اگر چاہتی ہو کہ اسکی تمام اندرونی طاقتیں، ایک سمت، ایک مقصد کی جانب اور ایک راہ پر گامزن ہوں، اگر یہ چاہتی ہو کہ اسکی تمام داخلی قوتیں اس سے باہر موجود اسلام مخالف طاقتوں کے خلاف صف آرا ہوں، تو اسے اسلامی معاشرے میں طاقت کے ایک مرکزی نقطے کی ضرورت ہے، ایک ایسے محور کی ضرورت ہے جس سے اسکی تمام داخلی قوتیں منسلک ہوں، سب اسی سے ہدایت حاصل کرتی ہوں، سب اسی کی بات سنتی ہوں، اسی کی بات مانتی ہوں، اور وہ امت کی تمام مصلحتوں اور اسکے نقصان میں جانے والے تمام امور سے واقف ہو، تاکہ وہ ایک طاقتور، دور اندیش اور بابصیرت سپہ سالار کی طرح محاذِ جنگ پر ہر ایک کو اسکے مخصوص کام پر متعین کرے۔

ضروری ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایک رہبر، ایک سپہ سالار اور ایک مرکزی قدرت موجود ہو، جو یہ بات جانتی ہو کہ تم سے کیا بن پڑے گا، مجھ سے کیا ہو سکے گا، دوسرے انسان کیا کرسکیں گے، تاکہ وہ ہر ایک کو اسکی قابلیت کے مطابق کام سپرد کرے۔ مثلاً بطورِ تشبیہ عرض ہے کہ کیا آپ نے قالین بافی کا کارخانہ دیکھا ہے؟ کچھ لوگ ایک جگہ بیٹھ کر قالین بُنتے ہیں، ہر ایک شخص کام کرتا ہے، وہاں بیٹھا ہوا ہر بچہ اور ہر بڑا دھاگے سے بنائی کا کام کرتا ہے۔ اگر ان کا یہ کام ایک دوسرے سے ہم ہنگ نہ ہو، اگر ان کے اوپر ایک بالا دست اتھارٹی نہ ہو، جو انہیں قالین کا ڈیزائن بتائے، اسکے بارے میں مخصوص ہدایت جاری کرے، تاکہ انہیں پتا چل سکے کہ انہوں نے کونسے دھاگے سے کام لینا ہے، اُسے کیسے پرونا اور کس انداز سے لے کر چلنا ہے۔ اگر کوئی ایسی مرکزی اتھارٹی نہ ہو، تو پتا ہے یہ قالین کیسا بن کر تیار ہوگا؟

آپ دیکھیں گے کہ اس کا دایاں حصہ مشرقی انداز کا ہے اور بایاں حصہ مغربی طرز کا، قالیچے کا ایک طرف کردی انداز کا ہے اور دوسرا طرف ترکمانی انداز کا، اس طرح ایک بے ترتیب نقش ونگار کی حامل اور ایک ناگوار قسم کی چیز بن کر تیار ہوگی۔ یہ جو آپ قالیچوں میں ایک خاص

انداز، توازن اور ترتیب دیکھتے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک تو اسکی تیاری کے بارے میں واضح ہدایت موجود ہوتی ہیں اور دوسرے ایک شخص مسلسل ان ہدایت کی جانب متوجہ کرر ہا ہوتا ہے۔

ولی (امام) کی خصوصیت

کوئی معاشرہ اگر یہ چاہے کہ اُسکی تمام طاقتیں ایک نکتے پر مرکوز ہوں، اُسکی کوئی توانائی ضائع نہ جائے اور اُسکی تمام قوتیں یکجا ہوجائیں (اپنے مخالف گروہوں، صفوں اور قوتوں کے مقابل ایک بند مٹھی کی صورت کام کریں) تو ایسے معاشرے کو ایک مرکزی قوت کی ضرورت ہے، اس کا ایک دل اور ایک قلب ہونا چاہیۓ۔

البتہ اس مرکز اور اس قلب میں کچھ خصوصیت ہونی چاہئیں۔ اسے انتہائی دانا ہونا چاہیۓ، قوتِ فیصلہ کا مالک ہونا چاہیۓ، ایک اندازِ فکر کا حامل ہونا چاہیۓ، اسے راہِ خدا میں کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیۓ، اور بوقتِ ضرورت اپنے آپ کو بھی فدا کردینے پر تیار ہونا چاہیۓ۔

ہم ایسی ہستی کو کیا نام دیتے ہیں؟

ہم اسے امام کہتے ہیں۔

امام، یعنی وہ حاکم اور رہنما، جو پروردگارِ عالم کی طرف سے اس معاشرے کے لئے معین کیا گیا ہو۔ اسی طرح جیسے خداوندِ متعال نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ [1]

یعنی میں نے آپ کو لوگوں کے لئے امام مقرر کیا ہے۔

لیکن یہ جو ہم کہتے ہیں کہ امام کا تعین خدا کی طرف سے ہونا چاہیۓ، اس کی دو صورتیں

---

[1] سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۱۲٤

ہیں: یا تو خدا امام کو نام اور نشان کے ساتھ معین کرتا ہے۔ جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام اور بقیہ ائمہ علیہم السلام کو معین کیا ہے۔ یا پھر خدائے متعال، امام کو نام کے ساتھ معین نہیں کرتا، بلکہ صرف نشان کے ذریعے معین کرتا ہے، جیسے امام علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ:

"فَأَمّا مَنْ كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِناً لِنَفْسِهِ حَافِظاً لِدِينِهِ مُخَالِفاً عَلٰى هَوٰاهُ مُطِيعاً لِاَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوامِ أَنْ يُقَلِّدُوهُ۔" [1]

علمائے دین میں سے جو کوئی اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو، اپنے دین کی حفاظت کرتا ہو، جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو کچلا ہوا ہو اور خدا کے احکام (خواہ وہ انفرادی احکام ہوں خواہ اجتماعی) کا مطیع ہو، تو لوگوں کو چاہئے کہ اس کی تقلید (پیروی) کریں۔

اس روایت میں امام علیہ السلام نے بغیر نام لئے ایک رہبر و رہنما کی خصوصیت اور علامات کا تعین کیا ہے۔ جو کوئی ان علامات پر پورا اترتا ہو، وہ رہبر و رہنما ہوگا۔

ہم آپ کی خدمت میں لفظ "امام" کے معنی بیان کرنا چاہتے ہیں۔ امام، یعنی پیشوا، یعنی حاکم، یعنی حکمراں، یعنی وہ ہستی جو جس طرف جائے لوگوں کو اسکے پیچھے پیچھے چلنا چاہیے، جسے خدا کی طرف سے ہونا چاہیے، جسے عادل ہونا چاہئے، منصف ہونا چاہیے، دیندار ہونا چاہئے، عزم و ارادے کا مالک ہونا چاہئے اور اسی طرح کی اور باتیں جو امام کے حوالے سے ہیں، جن کی تفصیل میں جانے کا فی الحال موقع نہیں ہے۔

پس ولایت کے قرآنی اصول کی رو سے، امام کا وجود لازم ہے اور اگر یہ عظیم الشان پیکر، جس کا نام امتِ اسلامی ہے، زندہ، کامیاب و کامران اور ہمیشہ مضبوط و مستحکم رہنا چاہتا ہے،

---

[1] وسائل الشیعہ۔ ج۱۸۔ص۹۵

تو اُس کا اِس متحرک اور پُر ہیجان قلب اور ہمیشہ مستحکم اور قدرت مند مرکز سے ربط ضروری ہے۔

پس ولایت کے دوسرے مظہر کے معنی ہیں امتِ اسلامیہ کے ہر فرد کا، ہر حال میں اس قلبِ امت سے محکم اور مضبوط رابطہ۔ یہ رابطہ فکری بھی ہونا چاہیے اور عملی بھی۔ امام کو نمونہ عمل قرار دینا، افکار و نظریات میں اسکی پیروی کرنا اور افعال، رفتار، سرگرمیوں اور اقدامات میں ٹھیک اس کے نقشِ قدم پر چلنا ولایت ہے۔

لہٰذا علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے افکار اور اپنے افعال میں علی علیہ السلام کے پیرو ہوں، آپ کے اور علی علیہ السلام کے درمیان ایک مضبوط، مستحکم اور اٹوٹ بندھن قائم ہو۔ آپ علی علیہ السلام سے جدا نہ ہوں۔ یہ ہیں ولایت کے معنی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم اس حدیث کے معنی سمجھ سکتے ہیں کہ:

"وِلَايَةُ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيطَالِبٍ حِصْنِي فَمَنْ دَخَلَ حِصْنِي اَمِنَ مِنْ عَذَابِي۔"

"علی ابن ابی طالبؑ کی ولایت میرا قلعہ اور حصار ہے، جو کوئی اس حصار میں داخل ہوگا، وہ خدا کے عذاب سے محفوظ رہے گا۔"

یہ ایک انتہائی خوبصورت حدیث ہے۔ یعنی اگر مسلمان اور قرآن کریم کے پیروکار افراد فکری اور نظریاتی لحاظ سے، عمل، جدوجہد اور سرگرمیوں کے اعتبار سے علی علیہ السلام کے ساتھ وابستہ ہوں، تو خدا کے عذاب سے امان میں رہیں گے۔

ایک ایسا شخص جو قرآن کریم کو نا قابلِ فہم سمجھتا ہو، وہ کیسے یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت رکھتا ہوں، اور فکری لحاظ سے علی علیہ السلام کے ساتھ تعلق رکھتا ہوں؟ جبکہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

وَ اعْلَمُوا أَنَّ هَذَا الْقُرْآنَ هُوَ النَّاصِحُ الَّذِي لَا يَغُشُّ وَ الْهَادِي

الَّذِی لَا یُضِلُّ وَ الْمُحَدِّثُ الَّذِی لَا یَکْذِبُ وَمَا جَالَسَ هَذَا الْقُرْآنَ أَحَدٌ إِلَّا قَامَ عَنْهُ بِزِیَادَةٍ أَوْ نُقْصَانٍ زِیَادَةٍ فِی هُدًی أَوْ نُقْصَانٍ مِنْ عَمًی [1]

”اور جان لو کہ یہ قرآن ایسا ناصح ہے جو فریب نہیں دیتا، ایسا رہنما ہے جو گمراہ نہیں کرتا اور ایسا کلام کرنے والا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ جو بھی اس قرآن کے ساتھ بیٹھا، وہ اس کے پاس سے ہدایت میں اضافہ اور گمراہی میں کمی کر کے اٹھا۔“

علی علیہ السلام، قرآن مجید کا اس طرح تعارف کراتے ہیں اور لوگوں کو اسکی جانب مائل کرتے ہیں۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن کو سمجھنا ممکن نہیں، کیا وہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت رکھتا ہے؟

ہرگز نہیں۔

علی علیہ السلام راہِ خدا میں اپنا پورا وجود فدا کرنے پر تیار ہیں۔ یہ ہے علی علیہ السلام کا کردار۔ جبکہ یہ شخص راہِ خدا میں اپنا ایک پیسہ، اپنی جان، اپنا معاشرتی مقام، اپنی راحت و رام، اپنی قیادت وسرداری قربان کرنے کو تیار نہیں۔ کیا ایسا شخص علی علیہ السلام کی ولایت رکھتا ہے؟!

علی علیہ السلام کی ولایت ایسا شخص رکھتا ہے، جس کا فکری اور نظریاتی لحاظ سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی علی علیہ السلام کے ساتھ اٹوٹ بندھن قائم ہو۔

اگر آپ درست طور پر غور وفکر کریں، تو ولایت کے جو معنی ہم نے بیان کئے ہیں، وہ ولایت کے کئے جاسکنے والے دقیق ترین اور ظریف ترین معنی ہیں۔

اب ذرا غور فرمایئے گا، ہم قرآن کریم کی سورہ مائدہ سے کچھ آیات آپ کی خدمت

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷٤

میں پیش کرتے ہیں۔ان آیات میں ولایت کے ایجابی پہلو،یعنی داخلی تعلق کے قیام کا ذکر بھی ہوا ہے،اور ولایت کے سلبی پہلو،یعنی خارجی تعلقات کے توڑنے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ان آیات میں ولایت کا وہ دوسرا پہلو،یعنی ولی کے ساتھ اتصال وارتباط بھی بیان کیا گیا ہے۔ ولی،یعنی وہ قطب،یعنی وہ قلب،یعنی وہ حاکم اور امام۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ

"اے صاحبانِ ایمان! یہود ونصاریٰ کو(یہودیوں اور عیسائیوں کو)اپنے اولیاء نہ بناؤ۔"

اَوْلِیَآءَ ولی کی جمع ہے۔ ولی ولایت سے ماخوذ ہے۔ ولایت یعنی پیوستگی، ولی یعنی پیوستہ اور جڑا ہوا۔ یہود ونصاریٰ کو اپنے سے نہ جوڑو،ان سے منسلک نہ ہو،انہیں اپنے لئے اختیار نہ کرو

بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ

اِن میں سے بعض،بعض دوسروں کے اولیا اور ان سے جڑے ہوئے ہیں۔

یہ نہ سمجھو کہ وہ علیحدہ علیحدہ بلاکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔قرآن کی زبان میں وہ تمہارے دین کی مخالفت میں یکجا ہیں۔

بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ

یہ سب پس میں ملے ہوئے ہیں۔

وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ

تم میں سے جو کوئی ان سے تولیٰ کرے گا،تو بے شک وہ ان ہی میں سے ہو جائے گا۔

تَوَلّٰی (تفعل کے باب سے)،یعنی ولایت کو قبول کرنا۔جو کوئی ان کی ولایت کے

دائرے میں قدم رکھے گا اوراپنے آپ کو ان سے منسلک کرے گا، وہ اُن ہی میں سے ہوگا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ.[۱]

بے شک خدا ظالم لوگوں کی ہدایت نہیں کرے گا۔

الف: بیرونی تعلقات

فَتَرَی الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوۡنَ فِیۡہِمۡ

تم ان لوگوں کو دیکھتے ہو جن کے دلوں میں بیماری ہے، وہ دوڑ دوڑ کر دشمنانِ دین کے کیمپ کی جانب جاتے ہیں۔

وہ اس بات پر اکتفا نہیں کرتے کہ معمول کے مطابق چل کر ان کی طرف جائیں، بلکہ دوڑ کر ان کی طرف جاتے ہیں۔ ان کے قریب جانے پر بھی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کی صفوں میں پوری طرح شامل ہوجاتے ہیں اور اگر پ اُن سے پوچھیں کہ دشمنانِ دین سے ئ اور جن کے متعلق تم جانتے ہو کہ وہ دین کے مخالف ہیں، اُن سے کیوں اس قدر ملے بیٹھے ہو، اور کیوں تم اُن کی مخالفت کرنے کی بجائے اُن سے دوستی کا اظہار کررہے ہو، تو وہ آپ کے جواب میں عذر تراشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

نَخۡشٰۤی اَنۡ تُصِیۡبَنَا دَآئِرَۃٌ ؕ

ہمیں ڈر ہے کہ ہمارے لئے کوئی مشکل اور دردِ سر کھڑا نہ ہوجائے۔

کیسے سنے ہوئے سے الفاظ لگتے ہیں۔

خدا ان کے جواب میں فرماتا ہے:

---

[۱] سورۂ مائدہ:۵۱

فَعَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِالۡفَتۡحِ اَوۡ اَمۡرٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖ

امید ہے کہ خدا مومنین کے گروہ کو فتح نصیب کرے گا، یا ان کے مفاد میں اپنی طرف سے کوئی حادثہ وجود میں لے آئے گا۔

اور جب یہ کام ہو جائے گا تو:

فَيُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ نٰدِمِيۡنَ.

اُس وقت اُن کے ساتھ مل جانے والے یہ بدبخت لوگ، پشیمان ہوں گے۔

شرمندہ ہوں گے، کہیں گے دیکھا ہم نے کیسی غلطی کی تھی؟ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ مومنین کو اس طرح کامیابی اور قوت نصیب ہوگی، تو ہم دشمنِ دین اور دشمنِ خدا کے ساتھ نہ ملتے، اپنے آپ کو بے عزت نہ کرتے۔

جب انہوں نے دشمنانِ خدا کے ساتھ ساز باز کے ذریعے اپنے آپ کو رسوا کر لیا تو:

وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَهٰٓؤُلَاۤءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ ۙ اِنَّهُمۡ لَمَعَكُمۡ ؕ

صاحبانِ ایمان کہیں گے کہ کیا یہی مومنین تھے، یہ خوش ظاہر اور وجیہ چہرے جنہوں نے بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں، کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں

یا جب ہم کوئی بات کہتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں ہم تمہارے ہم خیال ہیں، ہمیں تم سے کوئی اختلاف نہیں، ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو تم کہتے ہو۔ یہ لوگ باتیں تو اس قسم کی کرتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل بیمار ہیں، اِن کا ظاہر تو اچھا نظر آتا ہے لیکن اِن کا دل میلا، سیاہ اور نفاق سے لودہ ہے۔ اس دن مومنین کہتے ہیں کہ عجیب ہے، یہ لوگ کیسی کیسی قسمیں کھاتے تھے، کیا یہ وہی لوگ ہیں!

اَهٰٓؤُلَاۤءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ ۙ

کیا یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی سخت اور شدید قسمیں کھائی تھیں

اِنَّهُمۡ لَمَعَكُمۡ ؕ

قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں،

تمہارے ہم خیال اور ہم فکر ہیں۔

حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَاَصۡبَحُوۡا خٰسِرِيۡنَ.

ان کے اعمال برباد ہوگئے اور یہ لوگ سخت خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہیں۔

یہ آیات [1] یہاں تک بیرونی تعلقات کے بارے میں تھیں۔

ب: اندرونی تعلقات

انہی آیات کے تسلسل میں، اندرونی تعلقات کے بارے میں غور وفکر کیجئے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ

اے اہل ایمان! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پلٹ جائے۔

خدا کے دین کی نشر واشاعت کی وہ ذمے داری جو تم نے خدا پر ایمان کے ساتھ قبول کی ہے، اگر تم اس سے سبک دوش ہونا چاہو اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچانے سے کتراؤ تو یہ نہ سمجھنا کہ یہ بوجھ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا، یہ تمہاری غلط فہمی ہوگی، یہ افتخار ایک دوسری قوم کو نصیب ہو جائے گا۔

مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ ۙ

---

[1] سورہ مائدہ ۵۔ آیت ۵۱ تا ۵۳

تم میں جو کوئی اپنے دین سے پلٹ گیا اور مرتد ہوگیا، تو خداوندِ عالم ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا، جن سے خود خدا کو محبت ہوگی اور وہ بھی خدا سے محبت کرتے ہوں گے۔

کیا ہم خدا سے محبت کرنے والے لوگوں میں سے ہیں؟

بسا اوقات ہم اپنی زبان سے ایسے کلمات ادا کرتے ہیں، جن سے خدا کے ساتھ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ کیا ہمارے یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ ہم خدا سے محبت کرتے ہیں؟

اس بارے میں قرآن کریم میں ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ

اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ خدا سے محبت کرتے ہو، تو میری اتباع کرو، تا کہ خدا بھی تم سے محبت کرے۔ [1]

پس

يُحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ ۙ

یعنی وہ لوگ احکامِ الٰہی کے سو فیصد تابع ہوں گے اور خدا بھی ان سے محبت کرتا ہوگا اور یہ ایک دو طرفہ خاصیت ہے۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ

اِن لوگوں میں پائی جانے والی صفات میں سے ایک اور صفت یہ ہے کہ یہ مومنین کے لئے منکسر اور خاکسار ہیں۔ یہ خاکساری مومنین کے ساتھ اُن کے انتہائی گہرے بندھن اور تعلق کی علامت ہے۔ ان لوگوں میں عام مسلمانوں کے سامنے کسی قسم کی نخوت، غرور اور خوامخواہ کی خود پسندی نہیں پائی جاتی۔ یہ جب لوگوں کے سامنے آتے ہیں، تو انہی کا حصہ بن جاتے ہیں، لوگوں کے شانہ بشانہ ہوتے ہیں، انہی کے ہمراہ اور ہم سفر ہوتے ہیں، لوگوں کے لئے ہوتے ہیں، اپنے

---

[1] سورہ آلِ عمران ۳۔ آیت ۳۱

آپ کولوگوں سے علیحدہ نہیں کرتے ،ایسانہیں ہوتا کہ لوگوں سے فاصلے پر رہتے ہوں اور کبھی کبھار ان سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوں:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

مومنین کے سامنے خاکسار اور منکسر

اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

کفار، دشمنانِ دین اور مخالفینِ قرآن کے مقابل، سر اٹھا کے کھڑے ہوتے ہیں

یعنی اُن سے متاثر اور مرعوب نہیں ہوتے، اُن کے سامنے سر اٹھا کے رکھتے ہیں اورانہوں نے اپنے گرد فکرِ اسلامی کا ایک ایسا حصار اور دائرہ کھینچا ہوا ہوتا ہے کہ کسی صورت کفار سے متاثر نہیں ہوتے۔

يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

ان کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ یہ لوگ انتہائی بہادری اور دلاوری کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔جیسا کہ آیت میں ہے:

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

یہ خدا کا وہ لطف، فضل اور تفضّل ہے، جو وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور وہ صاحبِ وسعت اور علیم ودانا ہے۔[1]

بعد والی آیت اس قلب، اس امام اور اس پیشوا سے اسلامی معاشرے کے مختلف

[1] سورہ مائدہ ۵۔آیت ۵٤

حصوں کے تعلق کے بارے میں ہے۔

خوب غور کیجئے، تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ وہ مسائل جن کے بارے میں اکثر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ قرآنی مسائل نہیں ہیں، اُن کے بارے میں قرآن کس طرح صراحت اور بلاغت کے ساتھ گفتگو کر رہا ہے۔

(قرآن کریم نے) بیرونی روابط کے بارے میں گفتگو کی، اندرونی روابط کے بارے میں بات کی، اب اندرونی روابط کے مرکزی نکتے، یعنی امام اور پیشوا کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، قائد اور رہبر کے متعلق بات کرتا ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ

ولی اور قائم امر، وہ ہستی جسے اسلامی معاشرے اور امتِ اسلامیہ کی تمام سرگرمیوں کا محور و مرکز ہونا چاہئے، اور ان کے بارے میں اسی سے ہدایت لینی چاہئیں، وہ خدا ہے، لیکن خدا مجسم ہو کر تو لوگوں کے درمیان نہیں سکتا اور انہیں بنفسِ نفیس امر و نہی تو نہیں کر سکتا۔ پس پھر یہ محور و مرکز کون ہے؟

وَرَسُوْلُهٗ

واضح ہے کہ رسول اور خدا کے درمیان کسی قسم کی رقابت اور تنازع نہیں۔ پیغمبر، خدا کا نمائندہ ہے۔

لیکن جیسا کہ قرآن کریم نے کہا ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ [1]

پیغمبر آپ کو بھی مرنا ہے اور اِن سب نے بھی مر جانا ہے۔

(ظاہری طور پر) رسول بھی ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔

---

[1] سورہ زمر ۳۹۔ آیت ۳۰

پس رسول کے بعد یہ ذمے داری کس کی ہوگی اسے بھی واضح ہونا چاہئے۔لہٰذا خداوندِ عالم اُن ہستیوں کا تعارف کراتا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا

اور وہ لوگ جو ایمان لائے۔

لیکن کیا کسی کا بھی صرف صاحبِ ایمان ہونا کافی ہوگا؟ ظاہر ہے جواب نفی میں ہے۔ اُس میں دوسری صفات بھی پائی جانی چاہئیں:

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ

وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں۔

وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ.

اور جو رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام اسوہ مکتب

مذکورہ بالا علامات اور نشانیوں کا مجموعہ، یعنی امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام ولی کے طور پر معین ہوتے ہیں اور یہ اس صورت میں ہے جب اس آیت میں استعمال ہونے والے "واؤ" کو واوِ حالیہ لیں۔لیکن اگر بالفرض اس میں شبہ کریں اور کہیں کہ آیت کا مقصود وہ تمام مومنین ہیں جو ان خصوصیت کے حامل ہوں، تو ہم سوال کرتے ہیں کہ اس مکتب کے لئے کس ہستی کو علامت، (symbol) اسوہ اور نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہمیں اسلامی معاشرے میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام علیہ السلام کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ملتی۔لیکن اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اس آیت میں حضرت علی علیہ السلام مدنظر نہیں تب بھی اُس وقت کے اسلامی سماج میں ایسے مضبوط اور محکم ایمانی گروہ

کا مظہر علی ابن ابی طالب علیہ السلام علیہ السلام کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

اس مقام پر یہ یاددہانی ضروری ہے کہ اگر ہم تشیع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ولایت کی گفتگو کریں، تو ہمارے پیشِ نظر مسئلے کا مثبت پہلو ہے، اُس کا منفی پہلو نہیں اور جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ شیعہ اپنے آپ کو پہچانیں، اپنی فکر کو پہچانیں، اپنے عقیدے کو زیادہ سے زیادہ راسخ کریں۔ اسکے ساتھ ساتھ ہم اس بات کے بھی معتقد ہیں کہ شیعوں کو چاہیئے کہ آج برادرانِ اہل سنت کے ساتھ محاذ رائی ترک کر دیں۔ کیونکہ مسلمانوں کے سامنے اُن کا بیرونی دشمن موجود ہے۔

ہم اپنی اس گفتگو میں تشیع کا اثبات کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارا مقصود دوسروں کی نفی کرنا نہیں ہے، ہم خواہ مخواہ عقیدے اور سلیقے کے اختلاف کو ہوا دینا نہیں چاہتے۔ لیکن آپ کے لئے یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ آپ تشیع کو کس طرح سمجھتے ہیں۔ جس تشیع کا ذکر ہم کر رہے ہیں وہ اسلام سے جدا کوئی اور چیز نہیں ہے۔ اسلام تشیع سے جدا کوئی چیز نہیں۔ تشیع اسلام اور قرآن کے بارے میں جس نکتہ نظر کا حامل ہے، وہ ایک درست، منطقی، عادلانہ اور عاقلانہ نکتہ نظر ہے۔

پس اس جانب متوجہ رہیئے کہ ہم اصولِ اسلامی بیان کر رہے ہیں اور خود ہمارے پیشِ نظر جو گفتگو ہے وہ اسلام کے آئیڈیالوجیکل اصول کے بارے میں ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ آپ اس کے برخلاف کوئی رائے رکھتے ہیں۔

لہٰذا ہمارے پیشِ نظر مثبت مسائل اور مسئلے کا مثبت پہلو ہے۔ ہم اسلام کو اس طرح بیان کر رہے ہیں جیسا کہ مکتبِ تشیع میں سمجھتے اور جانتے ہیں اور دوسرے گروہ، جو ممکن ہے، اس سے مختلف سمجھتے ہوں، اور اس سے مختلف جانتے ہوں، اُن سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے اور اس بارے میں ہم اُن سے بحث بھی نہیں کرتے، نہ ہمارا اُن سے کوئی جھگڑا ہے، ہم باہم بھائی بھائی بھی ہیں اور دوستی کا ہاتھ بھی بڑھاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے سامنے ایک دشمن موجود

ہے، کیونکہ دشمن ہمارے سروں پر پہنچ چکا ہے۔ اس حالت میں ہمیں ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے کا حق نہیں ہے۔ یہ بھی ہمارا مسلک ہے جسے ہم بیان کرنا چاہتے تھے۔

تشیع اور شیعیت کے بارے میں گفتگو، شیعیت کی صداقت اور اسکے کھرے ہونے کی بنا پر ہے، اس لئے ہے کہ ہم تشیع کے معتقد ہیں اور اسلام کو تشیع کے نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں، اس لئے نہیں ہے کہ ہم شیعہ اور سنی کے درمیان اختلاف ایجاد کرنا چاہتے ہیں، ہرگز ہمارا مقصد یہ نہیں ہے، ہم اس اختلاف انگیزی کو حرام سمجھتے ہیں۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ.[1]

یہ وہی آیت ہے جس کے ہر جز کی تشریح کی گئی ہے اور یہاں اسے ایک مرتبہ پھر بیان کیا گیا ہے، اور اسکے معنی یہ ہیں کہ: تمہارا ولی امر خدا ہے، اس کا رسول ہے اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اگر ہم ولایت کو ملحوظ رکھیں، تو کیا ہوگا؟ کیا اس کا ہمارے اوپر کوئی اثر بھی ہوگا؟

ہم نے ولایت کے تین پہلوؤں کو بیان کیا ہے، جو اندرونی ربط و تعلق کی حفاظت، متضاد بیرونی مراکز سے رشتوں اور وابستگیوں کو توڑ دینا اور جسدِ اسلامی اور امتِ اسلامی کے قلب، یعنی امام و رہبر کے ساتھ دائمی اور گہرے تعلق کی حفاظت ہیں۔

اب اگر ہم نے ان تین پہلوؤں کو ملحوظ رکھا، تو کیا ہوگا؟ قرآن مجید، بعد والی آیت میں جواب دیتا ہے کہ:

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ

---

[1] سورہ مائدہ ۵۔ آیت ۵۵

الْغٰلِبُوْنَ.[1]

جولوگ خدا، اسکے رسول اور اہل ایمان کی ولایت قبول کریں گے، اِس بندھن کا لحاظ رکھیں گے اور اسکی حفاظت کریں گے، وہی کامیاب اور غالب ہوں گے، اور سب سے زیادہ کامیاب یہی لوگ ہیں اور یہ تمام دوسرے گروہوں پر غلبہ پائیں گے۔

[1] سورہ مائدہ۵۔آیت ۵٦

بہشت ولایت

ولایتِ فردی

ولایت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے، دو نکتے قابلِ ذکر ہیں:

۱: ولایت رکھنے والے فرد اور ولایت کے حامل معاشرے سے اجمالی شناسائی۔

۲: جس معاشرے میں ولایت پائی جاتی ہے، اس کا کردار اور اسکے مظاہر۔

آیت قرآنی میں غور وفکر، ولایت کے حوالے سے اہل بیت علیہم السلام کی جدوجہد اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کی مدد سے جو کچھ پتا چلا ہے وہ یہ ہے کہ ولایت کے کئی مظاہر ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان معاشرہ اپنے وجود کے باہر موجود عناصر سے منسلک اور غیر مسلموں سے وابستہ نہ ہو۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ منسلک اور وابستہ نہ ہونا ایک بات ہے اور سرے سے کوئی رابطہ نہ رکھنا ایک علیحدہ بات۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہہ رہے کہ عالمِ اسلام کو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے اپنے آپ کو دنیا سے الگ تھلک کر لینا چاہئے، اور کسی بھی غیر مسلم قوم، ملک اور طاقت سے رابطہ نہیں رکھنا چاہئے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اُسے اُن سے وابستہ، پیوستہ اور اُن کا تابع نہیں ہونا چاہئے، اُسے دوسری طاقتوں میں مُدغم نہیں ہوجانا چاہئے۔ بلکہ اُسے چاہئے کہ اپنی خودمختاری کی حفاظت کرے اور اپنے قدموں پر کھڑا ہو۔

ولایت کا دوسرا مظہر، مسلمان عناصر کے درمیان گہرا داخلی اتحاد اور ربط و تعلق ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے کا متحد اور یک جہت ہونا ہے۔ جیسے کہ احادیثِ نبویؐ اور احادیث معصومین علیہم السلام میں ہے کہ:

"مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَ تَرَاحُمِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى بَعْضُهُمْ تَدَاعَى سَآئِرُهُمْ بِالسَّهَرِ وَ الْحِمٰى۔" [۱]

حدیث میں انہی الفاظ کے نزدیک نزدیک كَمَثَلِ الْبُنْيَانِ بھی آئے ہیں۔ (مومنین کی مثال) ایک ایسے جسدِ واحد اور عمارتِ واحد کی سی ہے، جسے ایک دوسرے سے پیوست اور باہم متصل ہونا چاہئے، اور جسے دوسروں کی طرف سے پیش نے والی مزاحمتوں اور ان کی عداوتوں کے مقابل متحد ہونا چاہیئے۔ یہ نکتہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے حاصل ہوتا ہے۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ [۲]

مومنین کے سامنے خاکسار اور کفار کے سامنے صاحبِ عزت۔

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نے اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ [۳]

محمد، اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ اِن کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے انتہائی

---

[۱] نہج الفصاحہ۔ حدیث نمبر ۲۷۱۲۔ ص ۵۶۱

[۲] سورہ مائدہ ۵۔ آیت ۵۴

[۳] سورہ فتح ۴۸۔ آیت ۲۹

سخت اور پس میں انتہائی مہربان ہیں۔

جب یہ بیرونی مخالفین کے سامنے ہوتے ہیں، توتم انہیں مضبوط، مستحکم اور باہر کی کوئی تاثیر اور اثر قبول نہ کرنے والا پاؤ گے۔لیکن یہ خود پس میں انتہائی مہربان ہیں، کیونکہ ان کے درمیان دھڑے بندی نہیں ہے، اوراس عظیم جسد و پیکرِ اسلامی کے اعضا ایک دوسرے پر تاثیر ڈالتے ہیں، وہ سب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، سب ایک دوسرے کو خیر اور بھلائی کی طرف بلاتے ہیں، سب ایک دوسرے کو حق کی زیادہ سے زیادہ پیروی کی وصیت کرتے ہیں، سب ایک دوسرے کو راہِ حق میں زیادہ سے زیادہ ثابت قدمی کی نصیحت کرتے ہیں، ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔

جس طرح ہم نے پہلے مثال پیش کی، اُن دس کوہ پیما افراد کی مثال بیان کی جو کوہ پیمائی میں مصروف ہیں، جو پر پیچ پہاڑوں پر کمندیں ڈالتے ہوئے چل رہے ہیں، اور اگر ان میں سے کسی ایک کے پیروں کے نیچے سے کوئی ایک ڈھیلا یا ایک پتھر نکل جائے، تو یہ اسے سر کے بل درّے کی گہرائی میں پھینک دینے کے لئے کافی ہے۔اس صورت میں ان سب افراد کی سلامتی کا صرف ایک راستہ ہے، اور وہ یہ کہ وہ سب ایک دوسرے کی کمر کو انتہائی مضبوطی کے ساتھ رسی سے باندھ لیں، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں، تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک دوسرے کو آوازیں دیتے رہیں، کہ مثلاً فلاں تم راستے سے تو نہیں بھٹکے ہو، پیچھے تو نہیں رہ گئے ہو، بھوکے تو نہیں ہو؟

وہ ایک دوسرے سے مکمل طور پر باخبر رہیں، دیکھتے رہیں کہ کہیں ان کے درمیان کوئی فرد فکری، مادّی اور حق وحقیقت کی شناخت کے اعتبار سے دوسروں سے کمزور تو نہیں ہے۔اگر اُن کی صفوں میں کوئی ایسا فرد موجود ہو، تو سب اس کی ہدایت و رہنمائی کی کوشش کریں، سب اُسے راہِ راست پر لانے کی سعی کریں۔مختصر یہ کہ ایک ایسا گھرانہ تشکیل دیں جس کے افراد ایک دوسرے سے سو فیصدی مخلص ہوں۔

یہ اسلامی معاشرے میں پائی جانے والی ولایت کے مختلف مظاہر میں سے ایک مظہر تھا۔

مسلمان معاشرے کے لئے ولی کا ہونا ضروری ہے

ولایت کے مظاہر میں سے ایک اور مظہر، جو ان سب سے زیادہ اہم ہے اور پہلے اور دوسرے معنی کی ولایت کی بقا کا ضامن بھی ہے، وہ یہ ہے کہ خود معاشرے کے اپنے اندر ایک مقتدر مرکزی قیادت موجود ہو۔ کیونکہ اسلامی معاشرے کو ایک جسدِ واحد کی مانند ہونا چاہئے، جس کے مختلف اعضا اندر سے بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور پیوستہ ہوں اور باہر بھی بیرونی عناصر کے مقابل ایک بند مٹھی اور ایک جسد واحد کی مانند عمل کریں۔ یہ وحدت اور یکسوئی انہیں منظم کرنے والی ایک مرکزی قوت کے بغیر ممکن نہیں۔

لہٰذا اگر اسلامی معاشرے کے مختلف گوشوں میں ہر گوشے پر علیحدہ علیحدہ خود مختار قوتوں کی حکومت ہو، تو اس جسم کے اعضا ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اور ایک راستے پر گامزن نہیں ہو سکیں گے۔ یہ بالکل ایسا ہو جائیگا جیسے انسان کے اعصاب سے کام لینے والے نظام کو دو مختلف مراکز سے کنٹرول کیا جائے، ایک کا تعلق دائیں طرف سے ہو اور دوسرے کا تعلق بائیں طرف سے۔ اس صورت میں ایک عمل انجام دینے کے لئے دایاں اور بایاں حصہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر کام نہیں کریں گے۔ مثلاً ایک وزن اٹھانے کے لئے دایاں ہاتھ تو تیار ہوگا، لیکن بایاں ہاتھ کسی صورت یہ بوجھ اٹھانے پر تیار نہ ہوگا اور مٹھی بھینچ لے گا۔ لہٰذا اگر انسان کا اعصابی نظام کنٹرول کے دو مختلف مراکز سے حکم حاصل کرے گا، تو بدن کی حالت میں خلل واقع ہو جائے گا اور عمل کی انجام دہی، یا دشمن سے بچاؤ کے موقع پر مضحکہ خیز صورت اختیار کر لے گا، اور

دشمن کے شر سے محفوظ رہنے کے قابل نہیں رہے گا۔

اسلامی معاشرہ بھی اگر بر وقت اپنے دشمن سے بچنا چاہے، تو اس کے اندر کنٹرول کا مرکز محفوظ ہونا چاہیئے، اور اگر ایک اسلامی معاشرہ اپنے دشمن سے جنگ کرنا چاہتا ہے، تو لازم ہے کہ اس معاشرے کے تمام گروہ یکجا ہو کر دشمن کے مقابل آئیں اور اس کا سامنا کریں اور پس میں ہم ہنگ ہو کر اس پر ایک کاری ضرب لگائیں۔ ایسا نہ ہو کہ معاشرے کا ہر گروہ اپنی مرضی سے عمل کرنے لگے کیونکہ اس صورت میں انگور کے باغ میں جانے والے ان تین افراد کا سا قصہ پیش جائے گا جسے ملا نے نقل کیا ہے، اور دشمن ایک سازش کے ذریعے ان سب کا کام تمام کر دے گا۔ اسی طرح جیسے تاریخ اور تاریخِ اسلام میں بار ہا ایسا ہوا ہے۔

پس اگر اسلامی معاشرہ بر وقت اپنے مفادات کا حصول چاہتا ہے اور اپنے آپ کو ضرر اور نقصان سے محفوظ رکھنے کا متمنی ہے، تو اندرونی طور پر اس کے اعضا کو ایک دوسرے کے لئے ملائم اور باہم متحد ہونا چاہیئے، اور دشمن کے مقابل ایک بند مٹھی اور ایک دستِ واحد بن جانا چاہیئے۔

مختصر یہ کہ اگر وہ ولایت کے ان دو مظاہر اور دو پہلوؤں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، تو لازم ہے کہ اُن کے اندر کنٹرول کا ایک مقتدر مرکز موجود ہو، تا کہ معاشرے کے تمام فعال اور سرگرم عناصر اپنا فکری، عملی، دشمن کوب اور دوست نواز لائحہ عمل اسی مرکز سے حاصل کریں۔ یہ مرکز اسلامی معاشرے میں موجود تمام گروہوں کو منظم کرے، اور ہر ایک کو اُس کے لائق کام سپرد کرے، ان کے درمیان ٹکراؤ اور تصادم کا راستہ روکے اور تمام قوتوں کی ایک سمت میں رہنمائی کرے۔

ایسا مرکز اور ایسی ہستی، خدا کی جانب سے ہونی چاہیئے، اُسے عالم، آگاہ اور معصوم ہونا چاہیئے، اُسے اسلام کے تمام تعمیری عناصر کا عکاس ہونا چاہیئے، اُسے قرآن کا مظہر ہونا چاہیئے۔

ایسی ہستی کو ہماری اسلامی تعلیمات میں ولی کہا جاتا ہے۔

پس مذکورہ بالا دو پہلوؤں سے اسلامی معاشرے کی ولایت تقاضا کرتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایک ولی کا وجود ضروری ہے۔

یہ بھی ولایت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔

کون ولایت رکھتا ہے؟

اس کے بعد یہ سوال پیش آتا ہے کہ میں اور آپ ولایت رکھتے ہیں یا نہیں؟ ممکن ہے میں اور آپ ولایت رکھتے ہوں، لیکن کیا مجموعی طور پر ہمارا معاشرہ ولایت رکھتا ہے یا نہیں؟

ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ کیا یہ دونوں (فرد اور معاشرہ) ایک ہی نہیں ہیں؟ کیا یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟ ہم جواب میں کہیں گے کہ: جی ہاں، اگر ایک عضو از خود سالم ہو، تو اس ایک عضو کے سالم ہونے کے اولاً تو یہ معنی نہیں ہوں گے کہ پورا بدن سالم ہے اور ثانیاً یہ کہ اگر ایک سالم عضو ایک غیر سالم بدن میں ہو، تو وہ ایک سالم عضو کی تمام خوبیوں کا مالک نہیں ہوسکتا۔

پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ ولایت رکھنے والا ایک انسان کس قسم کا دمی ہوتا ہے۔ تاکہ اسکے ذریعے یہ جان سکیں کہ کیا میں اور آپ ولایت کے حامل ہیں، یا نہیں؟ اگر یہ بات ثابت اور واضح ہوجائے کہ میں اور آپ ولایت کے حامل ہیں، تو اسکے بعد ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ معاشرے کو کیسا ہونا چاہئے تاکہ وہ ولایت کا حامل ہو سکے؟

اس میں کوئی مانع نہیں کہ ایک بے ولایت معاشرے میں ولایت رکھنے والا ایک انسان پایا جائے۔ (البتہ ہماری مراد مفروضے کے اعتبار سے ہے، جس کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ اس میں کوئی مانع اور مضائقہ نہیں ہے، وگرنہ حقیقت میں بہت زیادہ مضائقہ ہے)۔

اب ذرا اس مسئلے کی جانب آتے ہیں کہ کیاایک انسان کے خود ولایت کا حامل ہوجانے سے اسکی ذمے داری ختم ہوجاتی ہے؟

کیابس اتنا کافی ہے کہ وہ خود ولایت کا حامل ہوجائے، چاہے اس کا معاشرہ ولایت سے محروم اور عاری ہی کیوں نہ ہو۔

کیاایسی زندگی ایک مطلوب اور پسندیدہ زندگی ہوسکتی ہے؟

اگر کوئی شخص خود ولایت کا حامل ہو،لیکن ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہو جو بے ولایت ہے،اور وہ معاشرے کی اس بے ولایتی کے حوالے سے کسی ذمے داری کا احساس نہ کرے،تو کیا اس کا اس ذمے داری کا احساس نہ کرنا،خود اسکی ولایت کو بھی نقصان نہیں پہنچاتا اور اُسے بھی خراب نہیں کردیتا؟

یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں آپ مسلمان مردوزن، بالخصوص مسلمان جوانوں کوسوچنا چاہیئے۔ممکن ہے میرے پاس اتنی فرصت اور موقع نہ ہو،اور اگر میں ان میں سے ایک ایک نکتے کو اس طرح بیان کرنا چاہوں کہ وہ واضح ہوجائے،اور تمام لوگوں کی سمجھ میں جائے،تو ان میں سے ہر ایک نکتے پر گھنٹوں گفتگو کی ضرورت ہوگی۔افسوس کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔یہی وجہ ہے جو میں ان نکات کو اختصار کے ساتھ عرض کررہا ہوں اور ان کے بارے میں غور وفکر اور ان کی موشگافیوں کو آپ پر چھوڑ رہا ہوں۔

اب ہم اس نکتے کا جائزہ لیتے ہیں کہ

اولاً ولایت کا حامل انسان، کس قسم کا انسان ہوتا ہے؟

ثانیاً یہ کہ ہماری اور معاشرے کی اور اکھٹے زندگی بسر کرنے والے انسانوں کی اجتماعی ہیئت کیسی ہونی چاہیئے کہ ہم ولایت کے حامل ہوسکیں،اور وہ کیا صورت ہے جس میں ہم ولایت کے حامل نہیں ہوں گے؟

کس صورت میں ایک معاشرہ اسلام کا مطلوب ولائی معاشرہ بنتا ہے، اور کس صورت میں اور کن حالات میں، اسلام کی بتائی ہوئی ولایت سے محروم رہتا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا ولایت رکھنے والے ایک شخص کے ذاتی طور پر ولایت رکھنے سے اسکی ذمے داری ختم ہوجاتی ہے؟ اوراب اس پر ولایت کا حامل معاشرہ بنانے کی ذمے داری عائد نہیں ہوتی؟

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ اگر انسان خودتو ولایت کا حامل ہو، لیکن ولایت سے محروم ایک معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہو، اوراسے اپنے معاشرے کوولایت کا حامل بنانے کی ذمے داری کا احساس نہ ہو، توکیا اس میں ذمے داری کے اس احساس کا نہ پایا جانا، خوداسکی ولایت کونقصان نہیں پہنچائے گا؟ کیا اسکی ولایت کواسی بات نے ضعیف اور مخدوش نہیں کردیا ہے کہ اس میں دوسروں کوولایت کا حامل بنانے کی سوچ نہیں پائی جاتی؟

یہ وہ مسائل ہیں جن پر ہمیں بحث اور گفتگو کرنی چاہیے۔

اب ہم ان میں سے کچھ مسائل بیان کریں گے۔

اس بحث کے مکمل ہونے کے بعد آپ خود ولایت کے بارے میں قرآن کے پیش کردہ اور حدیث کے بتائے ہوئے عالی اور عقل پسند معنی کا موازنہ اُن معنی سے کیجئے گا جو سست اور عمل سے جی چرانے والے رام طلب افراد نے تصور کر لئے ہیں۔ تا کہ آپ دیکھ سکیں کہ ان دونوں معنی کے درمیان کس قدر فرق پایا جاتا ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے ولایت کا حامل ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ جب کبھی اہل بیت علیہم السلام میں سے کسی کا نام سنےتو علیہ السلام کہے۔ سمجھتے ہیں کہ ولایت کا حامل ہونا یہ ہے کہ انسان کے دل میں محبتِ اہل بیت علیہم السلام پائی جاتی ہو۔ البتہ بے شک اہل بیت علیہم السلام کی محبت رکھنا واجب اور فرض ہے اور اُن کے اسمائے گرامی کو عزت و تکریم کے ساتھ زبان پر جاری کرنا، اُن

کے نام پر مجالس کا انعقاد، اُن کی خوشی، غمی سے سبق لینا، اُن کے مصائب بیان کرنا، اُن کے مصائب اور مسرتوں پر اُن کا ذکر کرنا اور اُن کی مظلومیت پر آنسو بہانا لازم ہے۔لیکن یہ سب چیزیں ولایت نہیں ہیں۔ولایت اِن سے بالاتر ہے۔ایسا شخص جو سیدالشہدا علیہ السلام کی مجلسِ عزا میں بیٹھ کر آنسو بہاتا ہے، وہ ایک اچھا کام کرتا ہے،لیکن اسے ولایت کا حامل ہونے کے لئے صرف اس اشک فشانی کو کافی نہیں سمجھنا چاہیے۔

وہ لوگ جن کے ذہن پر بعض ایجنٹ عناصر اور مفاد پرستوں کی مفاد پرستانہ یا جاہلانہ تعلیمات و تلقینات اثر انداز ہوئی ہیں، انہیں ذرا توجہ سے سننا چاہیئے، تاکہ بعد میں یہ نہ کہا جائے کہ کوئی سیدالشہدا علیہ السلام پر رونے کا مخالف ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ بسا اوقات سیدالشہدا علیہ السلام پر اشک فشانی ایک قوم کی نجات کا باعث بن سکتی ہے، جیسے کہ توابین قبرِ حسین علیہ السلام پر گئے اور وہاں بیٹھ کر اُنہوں نے دو یا تین روز صرف اور صرف گریہ کیا، اور ان کی اس گریہ وزاری کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انہوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوئے مرجانے کا عہد کیا اور کہا کہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ میدانِ جنگ میں جانے کے بعد زندہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ یہ ہے امام حسین علیہ السلام پر گریہ، کوئی اس گریئے کا مخالف نہیں ہے۔

کوئی انسان حسین ابن علی علیہما السلام اور علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی عظمت بیان کئے جانے کا مخالف نہیں۔ جو کوئی انہیں جانتا ہے، وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ان کا نام عظمت کے ساتھ لیا جانا چاہیئے۔ وہ گھرانہ جس کی میراث شہادت ہو اور جس کا عزیز ترین اثاثہ راہِ خدا میں فدا کاری اور جانثاری ہو، اور جس کا پورا وجود خدا کے لئے وقف ہو، انسان کو اس گھرانے کا ذکر عظمت ہی کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ اس بات کا شیعہ اور غیر شیعہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ یورپ، امریکا، یا کسی بھی کفرستان میں چلے جائیے، اور وہاں اُن کے سامنے علی

ابن ابی طالب علیہ السلام جیسی شخصیت کے حالاتِ زندگی بیان کیجئے۔آپ دیکھیں گے کہ وہ ان کے کردار پر فخر کرتے ہوئے، ایک ایسے انسان پر افتخار کرتے ہوئے جس کی زندگی میں یہ تمام کے تمام افتخارات موجود ہیں، وہ ان کے لئے تالیاں بجائیں گے، اُن کی تعظیم اوراحترام کریں گے، اوران کے نام کوآپ کی طرف سے ایک عزیز یادگار کی صورت اپنے ذہن میں محفوظ رکھیں گے۔

یہ چیز صرف شیعوں سے مخصوص نہیں ہے، جس کی بنا پر آپ سمجھتے ہیں کہ ولایت یعنی بس یہی محبتِ اہل بیت علیہم السلام۔البتہ یہ اُس ولایت کا ایک گوشہ اورشعبہ ہے جوانسان کوجنت میں لے جاتی ہے، یہ ولایت کا ایک انتہائی اہم حصہ شمار ہوتی ہے۔

کچھ لوگ ہیں جو واقعاً جہالت کی بنیاد پر، جو انشاء اللہ جہالت ہی کی بنیاد پر ہے مفاد پرستی کی بنیاد پر نہیں امام حسین علیہ السلام پر گریہ کرنے جیسے مسائل اور ولایت وتشیع کے باب میں بعض سطحی مسائل کا ذکر کرکے ولایت کوصرف انہی مسائل میں منحصر کرتے ہیں، اورتعجب ہے کہ ولایت کوسمجھنے والے، ولایت کوجاننے والے اور ولایت رکھنے والے لوگوں کوانہی باتوں سے ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔

انسان کی سرشت میں ولایت پائی جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ولی کے ساتھ فکری اورعملی طور پر زیادہ سے زیادہ وابستہ ہے، اوراسکی اس وابستگی میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔

ولی کوتلاش کیجئے، خدا کے ولی کو پہچانئے، اسلامی معاشرے کے حقیقی ولی کا تعین کیجئے۔ اسکے بعد ذاتی طور پر فکری لحاظ سے، عملی لحاظ سے، جذبات واحساسات کے لحاظ سے، راہ ورسم اورروش کے اعتبار سے اپنے آپ کواس سے متصل اورمرتبط کیجئے، اسکی اتباع کیجئے، اس انداز سے کہ آپ کی کوشش اسکی کوشش، آپ کا جہاد اس کا جہاد، آپ کی دوستی اسکی دوستی، آپ کی دشمنی اسکی دشمنی اورآپ کی صف اس کی صف ہو۔اس طرح کا انسان ولایت کا حامل انسان ہوتا ہے۔

ایسا شخص جو ولی کو پہچانتا ہو، ولی کی فکر کو پہچانتا ہو اوراس کا ہم فکر ہو، ولی کے عمل کو پہچانتا

ہو اور اُس کا عمل ولی کے عمل سے ہم جہت ہو، وہ ولی کی اتباع کرتا ہو، اپنے آپ کو فکری اور عملی طور پر ولی سے منسلک قرار دیتا ہو، ایسا شخص حاملِ ولایت ہے۔

جبکہ صورتحال یہ ہے کہ ہم نے ولایت کو صرف دل میں علی علیہ السلام کی محبت رکھنے اور امیر المومنین علیہ السلام کے لئے اشکوں کے چند قطرے بہا لینے میں منحصر کر دیا ہے۔ لیکن ہمارا عمل، علی علیہ السلام کے عمل کے برخلاف اور ہماری فکر علی علیہ السلام کی فکر کے مخالف ہے۔ ہم نے ولایت کو اپنے لئے ایک افسانہ، ایک فرسودہ قصہ اور ایک دیو مالائی چیز بنا لیا ہے، اور اپنے دل کو مطمئن کئے ہوئے ہیں کہ ہم حضرت علی علیہ السلام کی ولایت رکھنے والوں میں سے ہیں، اور اس بات پر خوش ہیں کہ وہ تمام امتیازات جو علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت رکھنے والوں کے لئے مخصوص ہیں، اُن سب کے ہم بھی قطعی اور یقینی طور پر حقدار ہیں۔

خدا جانتا ہے کہ یہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ساتھ انتہائی زیادتی اور اُن پر بہت بڑی جفا ہے، اسلام پر بہت بڑا ظلم ہے۔ کیونکہ ولایت اسلام سے تعلق رکھتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی نظر میں ولایت کے لئے عمل ضروری ہے۔

آپؑ فرماتے ہیں:

"وہ شخص جو اہل عمل ہے، وہ ہمارا ولی (دوست) ہے، اور وہ شخص جو اہل عمل نہیں، وہ ہمارا دشمن ہے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام ولایت کے یہ معنی بیان کرتے ہیں، کیونکہ آپ علیہ السلام کی نظر میں ولایت اس جاہل یا اس مفاد پرست شخص کی نظر میں ولایت سے مختلف ہے جو امام علیہ السلام کا نام لے کر دنیاوی مفاد حاصل کرتا ہے۔ ہمیں گہرائی کے ساتھ ولایت کے معنی سمجھنے چاہئیں۔ بصورتِ دیگر ہم پوری عمر جنت کی امید میں گزارنے کے باوجود موت کے بعد اس کی بو بھی نہ پا سکیں گے۔ انسان کا حاملِ ولایت ہونا، ولی کے ساتھ اُسکی مطلق پیوستگی اور وابستگی کا نام ہے۔

ولایت رکھنے والا معاشرہ

ولایت رکھنے والا معاشرہ کیسا ہوتا ہے؟

ولایت رکھنے والا معاشرہ وہ ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں اولاً تو ولی متعین ہو، اور ثانیاً وہ ولی اس معاشرے کی تمام قوتوں، تمام سرگرمیوں اور تمام فعالیت کا سرچشمہ اور مرکزِ ہدایت ہو، ایک ایسا نقطہ ہو، جس پر سماج کے چھوٹے بڑے دھارے کر ملتے ہوں، ایک ایسا مرکز ہو جس سے تمام احکام وفرامین جاری ہوتے ہوں، جو تمام قوانین کا اجراونفاذ کرتا ہو، سب کی نگاہیں اسی کی طرف لگی رہتی ہوں، سب اسی کی پیروی کرتے ہوں، زندگی کا انجن وہی اسٹارٹ کرتا ہو، کاروانِ ہدایت کا قافلہ سالار وہی ہو۔ ایسا معاشرہ، ولایت رکھنے والا معاشرہ کہلائے گا۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد پچیس برس تک معاشرے کی باگ ڈور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ پیغمبرؐ کے بعد پچیس سال تک اسلامی معاشرہ ولایت کے بغیر رہا تھا۔ اس معاشرے میں کچھ مسلمان ولایت کے حامل تھے، ابوذر ذاتی طور پر ولایت کے حامل تھے، مقداد ذاتی طور پر ولایت رکھتے تھے، کچھ اور لوگ ذاتاً ولایت کے مالک تھے، لیکن اسلامی معاشرہ ولایت کا حامل نہ تھا۔ یہاں تک کہ اسلامی معاشرے پر حضرت علی علیہ السلام کی حکومت قائم ہوئی اور اسلامی معاشرہ ولایت کا حامل ہو گیا۔

جب معاشرے میں امرونہی کا مرکز امام علیہ السلام ہو، جب تمام امور کی باگ ڈور امام علیہ السلام ہی کے ہاتھ میں ہو، جب عملاً معاشرے کا نظم ونسق امام علیہ السلام کے اختیار میں ہو، جب امام علیہ السلام ہی جنگ کا حکم دے، جب امام علیہ السلام ہی حملے کا فرمان جاری کرے، جب امام علیہ السلام ہی صلحنامہ تحریر کرے، تو ایسی صورت میں معاشرہ ولایت کا حامل ہوتا ہے۔ بصورتِ دیگر معاشرہ ولایت کا حامل نہیں ہوتا۔

اگر آپ ایسے معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہوں، تو خدا کا شکر ادا کیجئے۔ اگر یہ نعمت آپ کو میسّر ہو، تو خدا کا شکر بجا لایئے۔ کیونکہ ولایت کی نعمت سے بڑھ کر کوئی اور نعمت نہیں اور اگرپ کو ایسا معاشرہ میسّر نہیں، تو اسکے قیام کے لئے کوشش کیجئے اور اپنی ذات میں اور انسانی معاشرے میں ولایت قائم کیجئے۔

ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ علی علیہ السلام کی طرح زندگی بسر کریں، کوشش کرنی چاہیئے کہ علی علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلیں، کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے اور علی علیہ السلام کے درمیان، جو خدا کے ولی ہیں تعلق قائم کریں۔

ان باتوں کے لئے کوشش کی ضرورت ہے، جدوجہد کی ضرورت ہے، ان کے لئے خونِ دل پینا پڑتا ہے۔ اُسی طرح جیسے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے ولایت کے لئے جدوجہد کی، اسکے لئے صعوبتیں اٹھائیں۔

ائمہ علیہ السلام نے ولایت کو زندہ کرنے اور اسلامی معاشرے کے احیا کے لئے بھرپور جد وجہد کی، تا کہ وہ پودہ جو انسان کے نام سے اس زمین اور اس باغ میں کاشت ہوا ہے، ولایت کے جاں بخش اور ہدایت فریں خوشگوار پانی سے اُس کی نشو ونما کریں۔ ائمہ علیہ السلام نے اس مقصد کے لئے کوشش کی۔ معاشرے میں ولایت کے قیام کے لئے ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ اسلام کے ولی کو قوت بخشنے کے لئے ہمیں کیا کام کرنے چاہئیں۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا، کبھی علی ابن ابی طالب علیہ السلام، حسن ابن علی علیہ السلام، حسین ابن علی علیہ السلام، علی ابن حسین علیہ السلام سے لے کر امامِ آخر تک تمام ائمہ علیہم السلام اپنے ناموں اور خصوصیت کے ساتھ معین ہوتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ولی کا تعین نام کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ ایک ولی کے توسط سے یا بعض صفات بیان کر کے اُس کا تعین کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

"اَمَّا مَنْ کَانَ مِنَ الْفُقَهَآءِ، صَائِنًا لِنَفْسِهٖ حَافِظًا لِدِیْنِهٖ مُخَالِفًا عَلٰی هَوَاءُ مُطِیْعًا لِاَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِ اَنْ یُقَلِّدُوْهُ۔"[1]

"فقہاء میں سے جو فقیہ اپنے نفس پر مسلط ہو، خدا کے دین کا محافظ ہو، نفسانی خواہشات کی مخالفت کرتا ہو اور احکامِ الٰہی کا مطیع و فرمانبردار ہو، تو عوام کو چاہئے کہ اسکی تقلید کریں۔"

ان خصوصیت کو بیان کر کے ولی کا تعین کیا گیا ہے، اور یہ تعین بھی خدا کی طرف سے ہے۔ ہاں، اُس ولی کو نام لے کر معین کیا گیا ہے اور اس ولی کی خصوصیت بیان کی گئی ہیں۔ آپ نے خود حساب کیا، اندازہ لگایا، نمونہ تلاش کیا، حضرت آیت اللہ العظمیٰ آقائے بروجردی نظر آئے۔

جب انسان اپنا مقصد یہ بنائے کہ وہ معاشرے میں اسلامی قوانین اور الٰہی فرامین کا اس انداز سے اِحیا کرے گا، اُنہیں اس طرح زندہ کرے گا جس طرح ولایت تقاضا کرتی ہے، تو پھر وہ اس مقصد کے لئے جدوجہد کرتا ہے، اور اسکے لئے راستے اور طریقے تلاش کرتا ہے۔ فی الحال ہماری گفتگو راستوں اور طریقوں کے بارے میں نہیں ہے۔

ایسا معاشرہ جو ولایت کا حامل ہو جائے، وہ ایک ایسے مُردے کی مانند ہے جس میں جان پڑ گئی ہو۔ آپ ایک بے جان مُردے کا تصور کیجئے۔ اس کا دماغ ہے لیکن کام نہیں کرتا، نکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتی نہیں، دَہان ہے لیکن غذا نگل نہیں سکتا، معدہ، کلیجہ اور نظامِ ہضم ہے لیکن

---

[1] وسائل الشیعہ ۔ ج ۱۸۔ ص ۹۵

غذا کو ہضم نہیں کرتا، رگ ہے جس میں خون ہے لیکن خون رواں نہیں ہے، ہاتھ ہیں لیکن ایک چھوٹی سی چیونٹی کو بھی اپنے آپ سے دور نہیں کرسکتا۔

ایسا کیوں ہے؟

ایسا اس لئے ہے کہ اُس میں جان نہیں ہے۔ لیکن جب اس میں جان ڈال دی جاتی ہے،

تو اس کا دماغ کام کرنے لگتا ہے، اعصاب کام کرنے لگتے ہیں، اسکے ہاتھ چیزوں کو گرفت میں لینے لگتے ہیں، اس کا دَہان کام کرنے لگتا ہے، معدہ ہضم کرنے لگتا ہے، نظامِ ہضم جذب کرنے لگتا ہے، خون گردش کرنے لگتا ہے اور رواں ہوکر پورے بدن کو طاقت فراہم کرنے لگتا ہے، بدن کو گرم کرتا ہے، اسے کوشش اور جدوجہد پر لگاتا ہے، اور انسان چلتا ہے، دشمن کو مارتا ہے، دوستوں کو جذب کرتا ہے، اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ کامل کرتا ہے۔

ایک معاشرے میں ولایت کی اہمیت سمجھنے کے لئے آپ اس مثال کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھئے۔ مُردہ جسم ہٹا کر اُس کی جگہ انسانی معاشرہ لے لیئے، جان اور روح کی جگہ ولایت کو رکھ دیجئے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں ولایت نہ ہو، اُس میں صلاحیتیں ہیں لیکن ناکارہ ہوجاتی ہیں، برباد چلی جاتی ہیں، نابود ہوجاتی ہیں، ضائع چلی جاتی ہیں، یا اس سے بھی بدتر یہ کہ انسان کو نقصان پہنچانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ دماغ ہوتا ہے اور سوچتا ہے، لیکن فساد پھیلانے کی بابت، انسان کشی کی بابت، دنیا کو جلا ڈالنے کی بابت، انسانوں کو برباد کردینے کے بارے میں، استحصال، استبداد اور استکبار کی جڑیں مضبوط کرنے کے بارے میں۔ اُس کی آنکھیں ہوتی ہیں لیکن جو چیزیں اسے دیکھنی چاہئیں اُنہیں نہیں دیکھتا اور جنہیں نہیں دیکھنا چاہیئے اُنہیں دیکھتا ہے۔ اُس کے کان ہوتے ہیں لیکن حق کی بات نہیں سنتا۔ اُس کے اعصاب حق کی بات کو دماغ تک پہنچاتے ہیں لیکن دماغ اعضاو جوارح کو حق کے مطابق حکم نہیں دیتا، اعضا و جوارح حق کے مطابق عمل

انجام نہیں دیتے، دنیا کے حالات انسان کو حق کے مطابق عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

بے ولایت معاشرے میں چراغوں کی لَو بلند نہیں ہوتی اور اُن کی روشنی نہیں بڑھتی۔ اگر اُن میں تیل کا کوئی قطرہ ہوتا بھی ہے تو وہ ختم ہو کر یکسر خشک ہو جاتا ہے۔ وہ چراغ جنہیں پیغمبرؐ نے تیل فراہم کیا تھا، وہ بجھنے لگتے ہیں اور آپ نے دیکھا کہ وہ کیسے خشک ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ دنوں تک ان چراغوں کی لَو بلند تھی، یہ روشنی پھیلا رہے تھے، ماحول کو منور کر رہے تھے، کیونکہ انہیں پیغمبرؐ نے تیل دیا تھا۔ لیکن کیونکہ ان چراغوں اور مشعلوں کے سر پر ولایت کا سایہ نہیں تھا، لہٰذا ان کا تیل تہ میں بیٹھ گیا، خشک ہو گیا، اِن سے دھواں اٹھنے لگا، اِن کی روشنی مدھم ہو گئی، یہاں تک کہ معاویہ کا دور گیا جنہوں نے اسلامی معاشرے کی باگ ڈور یزید کے سپرد کر دی، اور پھر آپ نے دیکھا کہ کیا ہوا۔

وہی باتیں جو حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام نے انصار اور مہاجر خواتین سے کہی تھیں، لیکن انہوں نے سنی اَن سنی کر دی تھیں۔ اُن ابتدائی ایام میں فاطمۃ الزہرا علیہا السلام نے جو پیش گوئیاں کی تھیں، لیکن اُس دور کے غافل لوگوں نے نہ انہیں سنا نہ سمجھا، وہ تمام کی تمام پیش گوئیاں پوری ہوئیں۔ وہ "سیفِ صارم" وہ خونریز شمشیر، وہ تلوار جو حقیقتوں اور فضیلتوں کو قتل کر رہی تھی، وہ ہاتھ جو انسان اور انسانیت کا گلا گھونٹ رہے تھے، ان سب کے متعلق فاطمہ زہرا علیہا السلام نے بتا دیا تھا، بلکہ اُن سے بھی پہلے پیغمبرؐ نے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ لوگ دیکھ رہے تھے، سمجھ رہے تھے، بتا رہے تھے، لیکن اسلامی معاشرہ نہیں سمجھا۔ اِس کے کان بند اور بہرے ہو گئے تھے۔

آج جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی صدا کانوں میں گونج رہی ہے۔ اے حساس اور ہوشیار سامعتو سنو! جس معاشرے میں ولایت ہو، وہ معاشرہ ایک ایسا معاشرہ بن جاتا ہے جو تمام انسانی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے، وہ تمام چیزیں جنہیں خدا نے انسان کے کمال اور بلندی کے لئے دیا ہے، یہ معاشرہ اُن کی نشوونما کرتا ہے، انسانیت کے پودے کو تناور درخت میں تبدیل

کرتا ہے، انسانوں کو کمال تک پہنچاتا ہے، انسانیت کی تقویت کا باعث بنتا ہے۔اس معاشرے میں ولی، یعنی حاکم، یعنی وہ ہستی جس کے ہاتھ میں تمام امور کی باگ ڈور ہوتی ہے، پورے معاشرے کو خدا کی راہ پر ڈالتا ہے، اوراسے ذکرِ خدا کا حامل بناتا ہے۔ مال ودولت کے لحاظ سے، دولت کی منصفانہ تقسیم کرتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ نیکیوں کو عام کرے، کوشش کرتا ہے کہ برائیوں کی جڑ اکھاڑ دے، اُن کا خاتمہ کردے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ [1]

وہ لوگ جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکات ادا کرتے ہیں، نیکیوں کا حکم دیتے ہیں، بُرائیوں سے روکتے ہیں اور یہ طے ہے کہ جملہ امور کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

وہ لوگ جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں، تو وہ نماز قائم کرتے ہیں۔نماز خدا کے ذکر اور اسکی جانب معاشرے کی توجہ کی علامت ہے۔

اَقَامُوا الصَّلٰوةَ

نماز قائم کرتے ہیں، خدا کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، احکامِ الٰہی کے مطابق اپنے لئے راہِ عمل کا تعین کرتے ہیں۔

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

دولت کی عادلانہ تقسیم کرتے ہیں، زکات ادا کرتے ہیں۔قرآن مجید کی رو سے زکات کا دامن انتہائی وسیع ہے۔قرآن مجید میں زکات کی اصطلاح تمام مالی انفاقات اور صدقات پر محیط ہے۔

---

[1] سورہ حج ۲۲۔آیت ۴۱

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

کلی اور مسلمہ طور پر اسکے معنی یہ ہیں کہ دولت کے لحاظ سے سماج میں توازن پیدا ہو۔ زکات کے بارے میں ایسی روایات بھی ہیں، جو کہتی ہیں کہ زکات دولت میں توازن کا موجب ہے۔

وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

نیکیوں کو عام کرنا، اچھائیوں کو فروغ دینا اور منکرات کا قلع قمع کرنا ان حکمرانوں کے اوصاف میں سے ہے۔

عام طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی فقط یہ ہیں کہ میں آپ کو تلقین کروں کہ جنابِ عالی! آپ فلاں برا کام نہ کیجئے، فلاں اچھا کام کیجئے۔ جبکہ تلقین کرنا اور زبانی کہنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔

لوگوں نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے کہا: آپ معاویہ کے خلاف جنگ کیوں کر رہے ہیں؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: "اس لئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے۔" اچھی طرح سنئے اور نتیجہ نکالئے۔ جنگِ صفین میں امام علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ آپ کو معاویہ سے کیا واسطہ، آپ کوفہ جایئے وہ شام کا رُخ کرتا ہے۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں: خدا نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب کیا ہے۔

امام حسین علیہ السلام مدینہ سے نکلتے ہوئے فرماتے ہیں:

أُرِيدُ أَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ.[1]

میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں۔

دیکھئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ جبکہ ہماری نظر میں یہ

[1] مجموعۃ ورام/ ج2/ 11/ الجزء الثانی

کس قدر چھوٹا اور تنگ ہو چکا ہے۔

بہر حال جب کسی معاشرے میں ولایت ہو، تو وہاں نماز قائم ہوتی ہے، زکات ادا کی جاتی ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ بے جان جسم میں جان پڑ جاتی ہے۔

ولایت کا عملی قیام

ولایت کے مختلف پہلو

گزشتہ گفتگو کے تسلسل میں، ہمارا مقصد ولایت کے حوالے سے سامنے آنے والے مسائل کی تشریح ہے۔ ہماری گفتگو ولایت کے بارے میں ہے، اور اس بارے میں ہے کہ ولایت کیا ہے اور قرآن مجید میں کہاں سے اسکے بارے میں معلوم ہوتا ہے، اور یہ کتنے پہلوؤں، کتنی جہات اور کتنے جوانب کی حامل ہے۔ یہ چیزیں ہم اس سے پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ ہاں، کچھ مسائل ایسے ہیں جو ولایت کے لئے ضمنی مسائل شمار کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ خود ان مسائل میں سے ہر ایک مسئلہ اپنی جگہ پر اصولی اور ایک خاص جہت کا حامل مسئلہ ہے۔ اسلام کی بنیاد پر معاشرے کی سمت متعین کرنے اور اسلامی معاشرے کی راہِ عمل کے تعین کے لئے ان مسائل سے استفادہ کرنا چاہئے۔ آئندہ سطور میں ہم ان چند مسائل کو ترتیب وار بیان کریں گے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نے قرآن مجید سے ثابت کیا ہے کہ مسلمان معاشرے کے اندرونی اتحاد واتصال کو محفوظ رکھنے اور اُسے بیرونی وابستگیوں سے دور رکھنے کے لئے لازم ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایک مرکزی قوت موجود ہو۔ یہ قوت اس معاشرے کی تمام سرگرمیوں کی نگراں ہو، تمام میدانوں میں اس کی سمت اور اسکی پالیسیوں کا تعین کرے اور

معاشرے کے تمام گروہوں اور دھڑوں کی رہنمائی اور اُن کی تنظیم کرے۔ہم نے اسے ”ولی“ یعنی فرمانروا قرار دیا تھا۔یعنی وہ ہستی جس سے تمام قوتیں رہنمائی لیں، اور تمام کاموں میں اُس سے رجوع کیا جائے۔مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا شخص ہو کہ فکری اور عملی، ہر دو میدانوں میں اسلامی معاشرے کا نظم ونسق اسی کے ہاتھ میں ہو۔اسے ”ولی“ کہتے ہیں۔

ولی کون ہوسکتا ہے؟

اگر آپ ہم سے کہیں کہ ”ہم ولی کو پہچاننا چاہتے ہیں؟“ تو کیا ہمارے پاس کوئی ایسا مختصر جملہ ہے جس کے ذریعے ہم اسے بیان کرسکیں؟ البتہ ہم نے اس سوال کا جواب گزشتہ گفتگو کے درمیان، گاہ بگاہ عرض کیا ہے، اور آپ بھی جانتے ہیں، کوئی انجانی بات نہیں ہے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ منطقی اسلوب اور اس نکتے کے فطری تسلسل کے لحاظ سے بھی ہم اس بات کا جائزہ لیں۔

اس سوال کے جواب میں قرآن مجید کی ایک عبارت ہے، کہتا ہے: وہ ہستی جو معاشرے کی واقعی ولی ہے ”خدا“ ہے۔خدا کے سوا کوئی اور اسلامی معاشرے کا حاکم نہیں۔یہ وہی بات ہے جو توحید بھی ہم سے کہتی ہے، اور نبوت بھی اسی اصول کو ہمارے لئے ثابت کرتی ہے۔

اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ ولایت بھی ہم سے یہی کہتی ہے۔بنیادی طور پر ایک مکتب اور مسلک کے اصولوں کو اسی طرح ہونا چاہئے، کہ ان میں سے ہر اصول وہی نتیجہ دے جو نتیجہ اسکے دوسرے اصول دیتے ہیں۔ایسا نہ ہو کہ ہم مکتب کے ایک اصول سے جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں، اسکے دوسرے اصولوں سے اسکے مخالف نتیجہ اخذ کریں۔

افسوس کہ جو اسلام آج کے سادہ لوح مسلمانوں کے ذہن میں ہے، اس کے بعض

اصولوں سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں اُن کے بالکل برعکس نتائج دوسرے اصولوں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ ہستی جو اسلامی معاشرے میں امر و نہی کا حق رکھتی ہے، اور احکام و فرامین کے نفاذ اور معاشرے کی راہ و روش کے تعین کی حقدار ہے، مختصر یہ کہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں حاکمیت کا حق رکھتی ہے، وہ خداوندِ عالم کی ذات ہے۔ وَ اُوَلِیُّ الْمُؤمِنِینَ۔

جن آیات میں ولی یا اولیا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ہم نے اُن آیات میں سوچ بچار کیا ہے، اور ان سب کا تقریباً اجمالی مطالعہ کیا ہے، اور دیکھا ہے کہ یہ بات کہ "خدا اسلامی معاشرے کا ولی ہے، مومنین کا خدا کے سوا کوئی ولی اور مددگار نہیں، اور خدا کو انسان کے تمام امور کا حاکم ہونا چاہئے" ایک ایسا مسئلہ ہے، جو قرآن مجید کے مسلّمات میں شامل ہے۔

جن افراد کے ذہن میں شاید مفاہیم خلط ملط ہو جائیں، ہم اُنہیں یہ یاد دہانی کرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری گفتگو خداوندِ عالم کی تکوینی حاکمیت کے بارے میں نہیں ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ثابت اور معلوم ہے کہ زمین اور سمان کی گردش کو خداوندِ عالم اپنے ارادہ قاھرہ سے تنظیم کرتا ہے۔ ہماری گفتگو اس بارے میں ہے کہ انسانوں کی زندگی کے قوانین اور اسلامی معاشرے کے انفرادی اور اجتماعی روابط بھی خدا کے احکام و فرامین پر مبنی ہونے چاہئیں۔ یعنی نظامِ اسلامی اور حکومت و نظامِ علوی کے زیر سایہ الٰہی، اسلامی اور قرآنی معاشرے کا قانونی حاکم و فرمانروا صرف اور صرف خدا ہے۔

اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ "حاکم و فرمانروا خدا ہے" سے کیا مراد ہے؟

اپنے احکام پر عملدرمد کرانے کے لئے خدائے متعال تو لوگوں کے سامنے نے سے رہا؟

دوسری طرف انسانوں پر ایک انسان ہی حکومت کر سکتا ہے۔ لازم ہے کہ انسانوں کے امور و معاملات کی باگ ڈور ایک انسان ہی کے ہاتھ میں ہو۔ البتہ یہ جو ہم "ایک انسان" کہتے

ہیں اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم "ایک" پر زور دے رہے ہیں اور اجتماعی رہبری کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ ایسے انسان کی ضرورت ہے جو انسانوں کے امور و معاملات کی باگ ڈور ہاتھ میں لے۔ وگرنہ اگر انسانی معاشرے میں صرف قانون موجود ہو، چاہے وہ الٰہی قانون ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہاں حکومت کرنے کے لئے کوئی امیر، کوئی فرمانروا یا کوئی کمیٹی نہ ہو، مختصر یہ کہ اگر انسانی معاشرے میں قانون کے اجرا اور نفاذ کے لئے کوئی ناظر و نگہبان نہ ہو، تو اس کا نظم و نسق قائم نہ رہ سکے گا۔

رہی بات یہ کہ یہ انسان کون ہوسکتا ہے؟

وہ ایک یا کئی انسان، جنہیں انسان اور انسانی معاشرے پر عملاً حکومت کا اختیار حاصل ہے، جنہیں عملاً معاشرے کا ولی تسلیم کیا گیا ہے، جنہیں عملاً معاشرے کی ولایت اپنے ذمے لینی ہے، کون لوگ ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

تاریخی حقائق بھی اس سوال کے مختلف جواب دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے:

اَلْمُلْکُ لِمَنْ غَلَبَ۔

مراد یہ ہے کہ جو کوئی غالب جائے، وہی مملکت کا مالک ہوگا۔ یعنی جنگل کا قانون ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جس کسی میں زیادہ تدبیر پائی جائے، وہی حکمرانی کے لائق ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جسے لوگوں کی تائید حاصل ہو، وہی حکومت کا حقدار ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جو کوئی فلاں اور فلاں قبیلے سے تعلق رکھتا ہو، وہی حکمراں بننے کا اہل ہے۔ کچھ دوسرے لوگوں نے اور مختلف باتیں کی ہیں اور دوسری منطق اور افکار کا اظہار کیا ہے۔

دین اور مکتب نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

پروردگارِ عالم کی جانب سے عملاً جو ہستی معاشرے میں حکم وفرمان اور امر ونہی کی ذمے دار قرار دی گئی ہے، وہ اس کا "رسول" ہے۔ لہٰذا معاشرے میں جس وقت ایک پیغمبر جائے، تو پیغمبر کی موجودگی میں اُس کے سوا کسی اور حاکم کی حکومت کی کوئی گنجائش نہیں۔ پیغمبر، یعنی وہ ہستی جس کا معاشرے پر اقتدار ہونا چاہیئے۔

لیکن جب دوسرے انسانوں کی طرح پیغمبر کی بھی وفات واقع ہو جائے، تو پھر کون حاکم وفرمانروا بنے گا؟

آیتِ قرآنی جواب دیتی ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

مومنین تمہارے ولی ہیں۔

کون سے مومنین؟

کیا دین ومکتب پر ایمان لانے والا ہر شخص اسلامی معاشرے کا ولی اور حاکم ہے؟

اس صورت میں جتنے مومن ہوں گے، اُتنی ہی تعداد میں حاکم بھی ہو جائیں گے۔

آیتِ قرآن ایک معلوم اور متعین انسان کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ، اور اسلام کے شارع اور قانون گزار کی نظر میں معین ایک ہستی کو حکومت کا حقدار قرار دیتے ہوئے، اسکے انتخاب یا انتصاب کی وجہ بھی بیان کرتی ہے، اور اس طرح ایک معیار فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا کہتی ہے کہ:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، اور واقعی ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ لفظ "اٰمَنُوْا" کے اطلاق کا لازمہ یہ ہے کہ "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" اُن لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے جنہوں نے اپنے عمل سے اپنے ایمان کی تصدیق کی ہے۔ پس "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" پہلی شرط یہ ہے کہ واقعاً

مومن ہو، دوسری شرائط بھی ہیں:

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ

اور اُن مومنین میں سے ہو جو نماز قائم کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا ہے کہ جو نماز پڑھتے ہوں۔ کیونکہ نماز پڑھنا ایک چیز ہے اور نماز کا قیام کرنا دوسری چیز۔ اگر نماز پڑھنا مقصود ہوتا، تو "یصلّون" کہا جاسکتا تھا، جو ایک مختصر تعبیر ہے۔ایک معاشرے میں" اقامتِ صلات" کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں روحِ نماز زندہ ہو، معاشرے میں نماز پڑھنے کا چلن عام ہو اور آپ جانتے ہیں کہ نماز خواں معاشرے سے مراد ایک ایسا معاشرہ ہے جس کے تمام گوشوں میں ذکرِ خدا اور یادِ خدا مکمل طور پر موجزن ہو۔

آپ کے علم میں ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جس میں خدا کا ذکر اور اسکی یاد موجزن ہو، اُس میں کوئی جرم، کوئی خیانت واقع نہیں ہوتی۔ اس معاشرے میں انسانی اقدار کی کوئی توہین نہیں ہوتی۔ ایسا معاشرہ جس میں خدا کی یاد موجزن ہو، اور جس میں زندگی بسر کرنے والے افراد ذکرِ خدا میں مشغول ہوں، اُس کا رخ خدا کی جانب ہوتا ہے، اور لوگوں کے تمام کام خدا کے لئے ہوتے ہیں۔

معاشرے میں پائی جانے والی گھٹیا باتوں، مظالم اور ظلم و زیادتی کے سامنے تسلیم ہو جانے کا واحد سبب خدا فراموشی ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں خدا کی یاد پائی جاتی ہے، اُس کا حاکم علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی طرح ہوتا ہے، جو ظلم نہیں کرتا، بلکہ ظلم کا قلع قمع کرتا ہے۔ اسکے عوام ابوذر غفاری کی مانند ہوتے ہیں، جو مار پیٹ سہنے کے باوجود، جلاوطن کئے جانے کے باوجود، ڈرائے دھمکائے جانے کے باوجود، بے وطن کئے جانے اور بے کس رہ جانے کے باوجود ظلم کے آگے سر نہیں جھکاتے، خدا کا راستہ نہیں چھوڑتے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس میں ذکرِ خدا ہے، یہ وہ معاشرہ ہے جس میں قیامِ نماز ہے۔ ایسا مومن جو معاشرے میں نماز قائم کرتا ہے، یعنی معاشرے

کا رُخ خدا کی جانب کرتا ہے، اور معاشرے میں ذکرِ الٰہی کو رائج اور برقرار کرتا ہے، وہ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ۔۔۔۔ ان لوگوں میں سے ہے جو نماز قائم کرتے ہیں۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، وہ لوگ:

وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ.

دولت کی عادلانہ تقسیم کرتے ہیں، زکات دیتے ہیں، راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔

اس کے فوراً بعد فرماتا ہے:

وَهُمْ رٰكِعُوْنَ.

یعنی رکوع کی حالت میں (زکات دیتے ہیں)۔

یہ ایک خاص موقع اور داستان کی جانب اشارہ ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ: وَہُمْ رَا کِعُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ ہمیشہ رکوع کی حالت میں رہتے ہیں اور یہاں کسی خاص واقعے کی جانب اشارہ نہیں ہے۔ لیکن عربی زبان سے واقفیت اس احتمال کو مسترد کر دیتی ہے، اور هُمْ رَاكِعُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ ایک انسان مساوات کو اس قدر پسند کرتا ہو، راہِ خدا میں خرچ کا اس قدر مشتاق ہو، فقر اور فقیر کو دیکھنا اسکے لئے اتنا تکلیف دہ ہوتا ہو کہ اپنی نماز ختم ہونے کا انتظار نہ کرے۔ اس انسان میں راہِ خدا میں خرچ کی جانب اس قدر شدید رجحان پایا جاتا ہے اور یہ انسان اس فریضے کی ادائیگی میں اس قدر محو ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں صبر نہیں کر سکتا، تحمل کی مجال نہیں رکھتا۔ جب وہ ایک فقیر کو دیکھتا ہے، ایک ایسا منظر دیکھتا ہے جس منظر کو خدا پسند نہیں کرتا، اور اسے بھی وہ پسند نہیں ہوتا، اور اس وقت اسکے پاس ایک انگوٹھی کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہوتی، تو وہ اسی حالتِ نماز میں اپنی وہ انگوٹھی اتار کر سائل کو دے دیتا ہے۔

لہٰذا یہ تاریخ میں ایک جانا پہچانا اور خاص واقعہ ہے، جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا تھا۔ آنجناب علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک فقیر آیا، آپ علیہ السلام نے راہِ

خدا میں اسے اپنی انگوٹھی عطا کر دی، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

پس جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ آیت اشارتاً علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو ولی امر مقرر کر رہی ہے۔ البتہ اس انداز سے معین نہیں کر رہی جس طرح تاریخ میں لوگوں کو زور زبردستی کے ساتھ معین کیا گیا ہے۔ مثلاً جب معاویہ اپنے لئے جانشین معین کرنا چاہتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ میرا جانشین میرا بیٹا ہے، اور وہی میرے بعد میرے تخت پر بیٹھے گا۔ خدائے متعال اس انداز سے پیغمبر کا جانشین معین نہیں کر رہا، لیکن کیونکہ سربراہِ حکومت کی خصوصیت خدا پر ایمانِ کامل، معاشرے میں قیامِ نماز اور اپنے آپ کو فراموش کر دینے کی حد تک انفاق اور زکات کی ادائیگی سے لگاؤ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی میں پائی جاتی تھیں، لہٰذا خداوندِ متعال حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو خلیفہ کے طور پر معین اور نصب کرتے ہوئے اُن کی خلافت کا پیمانہ، کسوٹی اور حکمت بھی واضح کر رہا ہے۔ اس بنیاد پر اسلام میں ولی امر ایسا شخص ہوتا ہے جو خدا کا بھیجا ہوا ہو، ایسا شخص ہوتا ہے جسے خود خدا معین کرتا ہے۔

کیونکہ تصور یہ ہے کہ کائنات کی طبیعت کے مطابق یہاں کسی انسان کو دوسرے انسانوں پر حکمرانی کا اختیار حاصل نہیں ہے، اور کیونکہ وہ واحد ہستی جسے حکومت کا حق حاصل ہے وہ خدا ہے، لہٰذا وہ انسانوں کی مصلحت کے مطابق جسے چاہے یہ حق دے سکتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا کے کام بغیر مصلحت کے نہیں ہوتے، مرانہ نہیں ہوتے، اُن میں زور زبردستی نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا کے کام انسانوں کی مصلحت کے مطابق ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ معین کرتا ہے اور ہمیں (اسکے انتخاب کو) تسلیم کرنا چاہیئے۔

خداوندِ عالم پیغمبر اور امام کو معین کرتا ہے اور امام کے بعد آنے والے حاکم کے لئے بھی کچھ صفات معین کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ان صفات کے حامل لوگ ائمہ معصومین علیہم السلام کے بعد اسلامی معاشرے کے حکمراں ہوں گے۔

پس ولی کو خدا معین کرتا ہے۔ وہ خود ولی ہے، اُس کا پیغمبر ولی ہے، پیغمبر کے بعد آنے والے امام بھی ولی ہیں۔ خاندانِ پیغمبر سے تعلق رکھنے والے امام متعین کئے گئے ہیں جن کی تعداد بارہ ہے، اور بعد کے مدارج میں، وہ لوگ جو خاص معیارات اور کسوٹیوں پر پورے اُترتے ہوں، اُنہیں حکومت اور خلافت کے لئے معین کیا گیا ہے۔

البتہ یہ ایک آیت تھی جسے ہم نے آپ کے لئے بیان کیا۔ قرآن کریم میں اور دوسری آیات بھی ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر ہم نے ان تقاریر میں کیا ہے، اور بعض کو خود آپ کو قرآن میں تلاش کرنا چاہئے۔ اس بارے میں بکثرت آیات ہیں۔

اسلام سختی سے اس بات پر زور دیتا ہے کہ لوگوں کے امور کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھوں میں نہیں ہونی چاہئے جو انسانوں کو لے جا کر جہنم میں جھونک دیں۔

کیا تاریخ نے ہمارے سامنے اس نکتے کی نشاندہی نہیں کی ہے؟ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ اسلام کے ابتدائی شاندار دور کے کچھ ہی عرصے بعد اسلامی معاشرے کے ساتھ کیا گیا اور اسکے ساتھ کیا ہوا؟ اور اس معاشرے پر کیا اُفتاد پڑی؟ یہ ایک ایسا معاشرہ بن گیا جس میں لوگ نیک افراد کی قدر نہیں کرتے، ایک ایسا معاشرہ بن گیا جس میں لوگ نیکی اور بھلائی کے پیمانوں کو بدل ڈالتے ہیں اور اپنے ناصح، خیرخواہ اور مصلح کو نہیں پہچان پاتے۔ اس معاشرے کے افراد کو اس حد تک پہنچانے کے لئے اُن پر کس قدر کام کیا گیا ہوگا؟!

ظالم اور جابر حکمرانوں کی جانب سے اسلامی معاشرے میں کئے جانے والے مسموم پروپیگنڈے نے لوگوں کی معلومات کے دائرے اور اُن کے طرزِ فکر کو اس قدر بدل ڈالا تھا اور اُن کی حالت یہ کردی تھی کہ وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ سمجھنے لگے تھے۔ لہٰذا جب انسان دوسری اور تیسری صدی ہجری کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، اور حکومت اور خلافت کی جانب سے ڈھائے جانے والے مظالم سے لوگوں کی بے اعتنائی کو دیکھتا ہے، تو حسرت و یاس کی تصویر بن جاتا ہے

اورحیران ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کا پیمانہ صبر حضرت عثمان کے زمانے میں لبریز ہوگیا تھا، اورجنہوں نے ان کا محاصرہ کرلیا تھا، اورانہیں اس دردناک انداز سے خلافت سے معزول کر دیا تھا؟

کیا یہ وہی لوگ ہیں جو آج ایک عباسی خلیفہ کی شادی کی رات اس قدر خطیر رقم خرچ ہوتے دیکھ کر بے حس وحرکت بیٹھے رہتے ہیں جس کے ذریعے اسلامی معاشرے کے ایک بڑے حصے کے حالات سدھارے جاسکتے تھے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ مال کس قسم کے کاموں اورکیسی کیسی عیاشیوں پر خرچ کیا جارہا ہے، لیکن دم نہیں مارتے؟ مسلمانوں کا پیسہ کس طرح ذاتی معاملات میں اُڑایا جارہا ہے اوروہ اسکے صحیح یا غلط ہونے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے؟!

اگرایک ہزار افراد کا پیسہ کوئی ایک فرد اپنی ذات پر خرچ کرے۔ اسے اپنی عیاشیوں پر نہیں بلکہ اپنے نماز اورروزے پر خرچ کرے، تب بھی کیا یہ عمل جائز ہے؟!

لوگ دیکھا کرتے تھے کہ اسلامی معاشرے کے بیچوں بیچ اس قسم کے کام انجام دیئے جاتے ہیں، اسکے باوجود اُن کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔

شاید ہم نے کسی مناسبت سے یہ واقعہ بیان کیا ہو کہ ہارون رشید کا محبوب اور پسندیدہ وزیر جعفر برمکی ۲۸ تا ۳۰ سال کی عمر میں اپنی انتہائی محبوبیت کے دور میں شادی کرتا ہے۔ کیونکہ ہارون رشید، جعفر برمکی سے انتہائی محبت کرتا تھا، لہٰذا شادی کی اس تقریب میں شریک معزز مہمان دیکھتے ہیں کہ شادی کی رات دولہا اور دلہن پر نقل کی بجائے کوئی اور چیز نچھاور کی جارہی ہے۔ یہ مہمان جھپٹ پڑتے ہیں اور یہ چیز جتنی جس کے ہاتھ میں آتی ہے اتنی وہ اٹھالیتا ہے۔ اس چیز کو اٹھا کر غور سے دیکھنے پر اُنہیں پتا چلتا ہے کہ یہ انگلی کے پور کے برابر نازک ڈبیائیں ہیں، جنہیں خالص سونے سے بنایا گیا ہے۔ جب وہ ان ڈبیاؤں کو کھولتے ہیں، تو اُن کے اندر سے ایک انتہائی نازک کاغذ برآمد ہوتا ہے اورجب وہ اس کاغذ کو کھولتے ہیں، تو انتہائی تعجب کے ساتھ دیکھتے

ہیں کہ یہ اس قدر چھوٹا کیا گیا کاغذ ایک بڑا ورقہ ہے، جس پر تحریر ہے کہ ملک کے فلاں حصے کی زمین تمہاری ملکیت قرار دی گئی ہے!

خدا جانتا ہے کہ صرف ایک رات میں نہ جانے پانچ سو، ٹھ سو، ہزار جاگیروں کے فرمان انتہائی نازک کاغذ پر تحریر کر کے، سونے کی ڈبیوں کے اندر ایک دولہا دلہن پر نچھاور کئے گئے، اور انہیں ایسے لوگوں نے اٹھایا جنہیں خلیفہ جانتا بھی نہ تھا کہ وہ کون ہیں۔ مثلاً فرض کیجئے، فلاں وسیع باغ اور فلاں علاقہ ایک بچے کے ہاتھ لگ گیا، یا ایک بدمست بدمعاش کے ہاتھ چڑھ گیا، یا ایک کمین اور گھٹیا انسان کے ہاتھ میں آ گیا۔ ان لوگوں سے خلیفہ تو واقف نہیں تھا، اس نے تو بس ڈبیائیں پھینک دی تھیں۔ اب اس علاقے میں جس کا قطعہ زمین اس شخص کے ہاتھ آیا، لوگوں کا کس قدر حق پامال ہوگا، کس قدر مال و دولت برباد ہوگا، کس قدر حقوق پامال اور ضائع ہوں گے، ان کے لئے یہ اہم بات نہیں تھی اور وہ ان باتوں کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔

عین اسی زمانے میں جبکہ یہ فیاضیاں، بخششیں اور فضول خرچیاں جاری تھیں، یحییٰ علوی، طبرستان کی پہاڑیوں میں ظلم و ستم کے خلاف برسرپیکار تھے، اور اُن کی حالت یہ تھی کہ اُن کے اور اُن کے اہل خانہ کے پاس تن ڈھانپنے کے لئے صرف ایک کپڑا ہوتا تھا، جسے نماز پڑھتے ہوئے پہلے شوہر استعمال کرتا اور اسکے بعد اپنی بیوی کو دے دیتا تھا کہ وہ اس سے اپنا بدن چھپا کر نماز ادا کرے۔ پیغمبر کا گھرانہ جو ظلم و ستم کے خلاف برسرپیکار تھا، وہ اِن حالات میں زندگی بسر کر رہا تھا اور لوگ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود بے پروائی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ہمارا مقصد ہارون سے گلہ شکوہ کرنا نہیں ہے۔ ہارون اگر یہ کام نہ کرے، تو وہ ہارون ہی نہیں۔ طبقہ ہارون کا تو تقاضا ہی یہ ہے۔ جب تک یہ طبقہ موجود ہے، ایسے کام انجام دیئے جاتے رہیں گے۔ لہٰذا ہمیں اُس سے شکایت نہیں ہے۔ شکایت اور ہمارا گلہ اُن لوگوں سے ہے جو اسلام کے ابتدائی دور کی طرح حساس نہیں رہے تھے۔ وہ ہوشیاری اور شعور جو اسلام کے ابتدائی

دور میں ان کے اندر پایا جاتا تھا، وہ اس سے محروم ہو چکے تھے، اور اس صورتحال کے مقابل ذمے داری کا احساس کھو چکے تھے۔ یہ حالات دیکھ کر اُنہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا تھا۔

آخر یہ لوگ ایسے کیوں ہو گئے تھے؟

اس کی وجہ یہ تھی کہ انتہائی مضر، شرانگیز اور گھٹیا پروپیگنڈہ شدت کے ساتھ جاری تھا، اور پروپیگنڈے کے ذرائع اور مراکز سے لوگوں کے اذہان پر کام کیا گیا تھا۔

اسلامی معاشرے کے مختلف طبقات پر اور مملکتِ اسلامیہ میں سالہاں سال لوگوں کے اذہان پر، لوگوں کی روحوں پر، لوگوں کی نفسیات پر کام کیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں نوبت یہاں تک جا پہنچی تھی۔

پس آپ دیکھئے کہ اسلامی معاشرے میں حاکم کس قدر اہمیت رکھتا ہے، یہ بات کس قدر اہم ہے کہ حاکم کیسے ہونا چاہیے۔ اسلامی معاشرے کا حاکم ایسے شخص کو ہونا چاہیے جسے خدا نے معین کیا ہو۔

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کہتی ہے:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ [1]

"خدا اور اسکے رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے درمیان موجود صاحبانِ امر کی بھی فرمانبرداری کرو۔"

صاحبانِ امر سے کیا مراد ہے؟

وہ جاہل اور نادان مسلمان سمجھتا تھا کہ صاحبِ امر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو حکمراں

---

[1] سورہ نساء ٤۔ آیت ٥٩

بن بیٹھا ہو اور ہر وہ شخص جو فرمان دینے پر قادر ہو، وہ "اولی الامر" ہے۔

ہم کہتے ہیں، نہیں، ایسا شخص اولی الامر نہیں ہے۔ اگر ہر فرمانروا اولی الامر ہے اور قرآن کی رو سے اسے قانونی حیثیت حاصل ہے، تو فلاں پہاڑ پر، فلاں طاقتور لٹیرے کا فرمان چلتا ہے، وہاں سارے معاملات اسی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ پس کیا وہاں وہ اولی الامر ہے؟

شیعہ جس اولی الامر کے قائل ہیں، وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جسے خدا نے حکمرانی کا اختیار دیا ہو، وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے، جو اگرچہ "مِنْکُمْ" کے مطابق انسانوں میں سے ہے، لیکن اس نے ولایت خدا سے حاصل کی ہے، کیونکہ ولایتِ کبریٰ کا مالک خدا ہے۔

اب کیا ہارون رشید جیسے شخص کو اُسکی اس حالت کے ساتھ، اُسکی ان بے حساب بخششوں اور اُسکی ان فضول خرچیوں کے ساتھ، اس دم کشی کے ساتھ (کہ ایک روز اُس نے اسی جعفر برمکی اور اسکے خاندان کے بہت سے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ان کو نیست و نابود کر دیا اور بہت سے مومن مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالا، اور اسی طرح کے دوسرے کام کئے) اولی الامر قرار دیا جا سکتا ہے؟!

اُس دور کا مفتی کہا کرتا تھا کہ ہارون اولی الامر ہے، اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ اُن لوگوں کی جنگ اور تنازع اسی مسئلے پر تھی، کہ وہ امام علیہ السلام سے کہتے تھے کہ آپ کیوں اپنے زمانے کے اولی الامر کے خلاف ہیں۔

پس اس مسئلے میں تشیع کا نکتہ نظر انتہائی ٹھوس اور گہرا ہے۔ تشیع، قرآن مجید کے ذریعے یہ ثابت کرنے کے ساتھ کہ اولی الامر کا تقرر خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ایسے معیار اور پیمانے (standards) بھی لوگوں کے حوالے کرتی ہے جن کی موجودگی میں لوگ فریب نہ کھا سکیں، یہ نہ کہیں کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہمارے سر آنکھوں پر لیکن ان کا جانشین ہارون رشید بھی ہمیں اسی طرح محترم ہے۔ منصور عباسی کہا کرتا تھا کہ میں امام حسن علیہ السلام کو خلیفہ مانتا ہوں، لیکن انہوں نے

(نعوذ باللہ) پیسے لے کر خلافت کو فروخت کر دیا تھا، لہٰذا اُنہیں خلافت کا حق حاصل نہیں اور جن لوگوں کو انہوں نے خلافت فروخت کی تھی ہم نے اُن سے بزور بازو خلافت چھینی ہے، لہٰذا اب یہ ہماری ملکیت ہے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے، وہ لوگ بظاہر علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی خلافت کے قائل تھے، اسکے باوجود منصور عباسی کو اُن کے جانشین کے طور پر قبول کرتے تھے۔ انہیں ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد اور ٹکراؤ نظر نہیں آتا تھا۔

لیکن شیعہ کہتے ہیں کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ اگر تم علی علیہ السلام کو مانتے ہو، تو تمہیں خلافت اور ولایت کے معیار کو بھی قبول کرنا چاہئے۔ تمہیں یہ بات ماننی چاہئے کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کیونکہ ان تمام معیارات پر پورے اُترتے تھے، اس لئے ولی کے طور پر اُن کا انتخاب ہوا تھا؟

پس اگر کوئی ان معیارات پر پورا نہ اُترتا ہو، یا اُس میں ان کے برعکس خصوصیت پائی جاتی ہوں، تو اُسے اپنے آپ کو علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا جانشین کہنے کا حق نہیں ہے۔ اسے حق نہیں پہنچتا کہ وہ شیعوں کی ولایت کا اور ولی امر ہونے کا دعویٰ کرے، اور کسی کو اسے ماننے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ یہ وہ اوّلین نکتہ ہے جو ولایت کے مسئلے میں پیش آتا ہے۔ البتہ ہم نے دوسرے نکتے کی جانب بھی اسی جگہ اشارہ کیا ہے اور اس کے بارے میں آیت بھی بیان کی ہے۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ آپ کس دلیل کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ ولایتِ امر خدا کے اختیار میں ہے اور خدا کی چیز ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے اس دعوے کی بنیاد ایک طبیعی حکمت ہے، جسے اسلامی تصورِ کائنات میں مشخص اور معین کیا گیا ہے۔ اسلامی تصورِ کائنات کی رو سے کائنات کی ہر چیز کا سرچشمہ قدرتِ الٰہی ہے:

وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔ [1]

[1] سورہ انعام ۶۔ آیت ۱۳

روز وشب میں جو کچھ ساکن ہے وہ خدا کی طرف سے ہے۔ جب تمام موجوداتِ خلقت کا مالک وہ ہے، اور تمام چیزوں پر تکوینی حکومت اسکے اختیار میں ہے، تو تشریعی اور قانونی حکومت بھی اسی کے اختیار میں ہونی چاہیئے۔ اسکے سوا کوئی چارہ نہیں۔

یہ دوسرا نکتہ تھا، اب ہم بعد کے نکات کی جانب آتے ہیں۔

اب بعد کی آیت پر توجہ دیجئے، جو بیان کرتی ہیں کہ:

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا.

بے شک خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل کو پلٹا دو۔

وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ

اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ، حکومت اور قضاوت کرو، تو عدل وانصاف کے مطابق کرو۔

اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا. [1]

بے شک پروردگار تمہیں بہترین چیز کی نصیحت کرتا ہے کہ بے شک پروردگار سننے اور دیکھنے والا ہے۔

پس وہ تمہیں جس چیز کا حکم دیتا ہے اسکی بنیاد اُس کا کامل سننا، جاننا اور ہمہ گیر علم ودانش ہے۔ کیونکہ وہ تمہاری اندرونی حوائج وضروریات سے بھی باخبر ہے اور تمہارے مستقبل پر بھی نظر رکھتا ہے۔ لہٰذا تمہیں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ تمہیں فراہم اور عطا کرتا ہے۔

اس پہلی آیت میں امانت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، اور کہا گیا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل کے حوالے کرو، اور یہ درحقیقت دوسری آیت کے لئے زمین ہموار کرنا ہے۔

ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ امانت فقط یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو ایک روپیہ

---

[1] سورہ نساء ٤۔ آیت ٥٨

دوں اور پ مجھے وہ ایک روپیہ واپس لوٹا دیں۔ امانت کے اہم ترین مظاہر اور نمونوں میں سے یہ ہے کہ انسان اُس شئے کو جو لوگوں کے درمیان خدا کی ہے اُسکے اصل مقام اور اُسکے اہل کے حوالے کرے۔ "اطاعتِ الٰہی" جو انسان کا خدا کے ساتھ میثاق اور معاہدہ ہے، اُس پر صحیح صحیح عمل ہونا چاہیئے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ خدا کی اطاعت کرے، اور جس کی اطاعت کا خدا نے حکم دیا ہے اسکی اطاعت کرے۔ یہ امانتداری کی بہترین مصداق ہے۔

بعد والی آیت، یعنی سورہ نسا کی انسٹھویں آیت میں ارشادِ الٰہی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

اے ایمان لانے والو

اَطِيْعُوا اللّٰهَ

خدا کی اطاعت کرو

وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

اور خدا کے رسول کی اطاعت کرو

وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ [1]

اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تمہارے درمیان صاحبِ امر ہیں۔

[1] سورۂ نساء:۵۹

ولی امر مسلمین حکم خدا کا نفاذ کرتا ہے

یہاں دوسرے نظریات اور تصورات پر اسلامی نظریئے کے امتیاز کی وجہ اور اُن سے اس کے محل اختلاف کا پتا چلتا ہے۔ اسلامی نظریہ یہ نہیں کہتا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب حکومت کی ضرورت نہیں رہے گی، اور یہ کسی ایسے دن کی پیش گوئی نہیں کرتا جس دن معاشرے میں حکومت نہیں ہوگی۔ جبکہ بعض دوسرے مکاتب، ایک ایسے دن کی پیش گوئی کرتے ہیں جب معاشرہ، ایک ئیڈیل معاشرہ بن جائے گا اور اس ئیڈیل معاشرے کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں کوئی حکومت نہیں ہوگی۔ لیکن اسلام ایسی پیش گوئی نہیں کرتا۔

خوارج نے حکومتِ الٰہی کا نعرہ لگا کر کہا کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو (حکمران) نہیں ہونا چاہئے۔ وہ کہتے تھے:

لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ

یعنی حکومت صرف خدا کا حق ہے۔

ان کے جواب میں امیر المومنین علیہ السلام کا کہنا یہ تھا کہ:

کَلِمَۃُ حَقٍّ یُرَادُ بِھَا الْبَاطِلُ۔[1]

بات صحیح ہے لیکن اس کا مقصد باطل ہے۔

ان کی بات درست ہے اور حقیقی حاکم خدا ہے۔ وہ ہستی جو احکام وفرامین وضع کرتی ہے

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۴۰

اورجس کے ہاتھ میں زندگی کے تمام امور کی باگ ڈور ہے، وہ خدا ہے۔لیکن کیا تمہارا کہنا یہ ہے کہ:

لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ،

یا یہ کہہ رہے ہو کہ:

لَا اِمْرَۃَ اِلَّا لِلّٰہِ؟

قانون اورحکومت خدا کی ہے،لیکن قانون کا اجراونفاذ کون کرے گا؟ کیا تمہاری مراد یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اورکو قانون کا اجرانہیں کرنا چاہیئے؟ لہٰذا آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:

لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِیْرٍ.

بہرحال انسانی معاشرے کے لئے ایک امیر ضروری ہے، ایک حاکم اور فرمانروا ضروری ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اسکی ہدایتِ اجتماعی کے لئے ایک مجری قانون ہونا لازم ہے۔صرف قانون کا ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسا فردبھی ہونا چاہیئے جو اس قانون کا اجرا کرے، اوراسکے صحیح صحیح نفاذ پرنظر رکھےاوریہی اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُم ہے۔

لیکن کیا محض اولی الامر مراد ہے؟اور جو کوئی بھی فرمانروابن بیٹھے درست ہے؟! جبکہ کثرت سے دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی جگہ دوافراد ایک دوسرے کے برعکس فرمان جاری کرتے ہیں۔اس صورت میں کیا دونوں اولی الامر ہوں گے؟! یا بکثرت دیکھا گیا ہے کہ ایک انسان نے ایسا فرمان جاری کیا ہے جوعقل کے برخلاف ہےاورعقل وخرداس فرمانروا کی نفی کرتی ہے۔کیا پھر بھی ایسا فرمانرواولی الامر ہوگا؟!

یہ وہ مقام ہے جہاں ہمارے اوراہل سنت کے طرزِ فکر کے درمیان ایک بنیادی اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ہم کہتے ہیں کہ اولی الامراورفرمانروا، ایسے شخص کوہونا چاہیئے جوخدا کے

فراہم کردہ معیارات پر پورا اترتا ہو۔ جبکہ اہل سنت عملاً اس قسم کی شرط کو شرط نہیں سمجھتے اور اسکے مطابق عمل نہیں کرتے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔[1]

پس اگر کسی چیز میں تنازع اور اختلاف پیدا ہو جائے، تو اُسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو، اگر تم خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی تمہارے حق میں بہتر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔

یہ آیت لائق حکمرانوں کی حکمرانی کے اچھے نتائج اور نالائق حکمرانوں کی حکمرانی کے بُرے نتائج کی جانب لوگوں کو توجہ کرتی ہے۔ بعد والی آیت میں اس فرمان سے منھ موڑنے والے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ.

کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا خیال یہ ہے کہ وہ آپ پر اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

وہ اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہیں، جبکہ وہ ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں جو خدا پر ایمان کے منافی ہیں۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ.

اور اسکے باوجود چاہتے ہیں کہ طاغوت سے فیصلہ کرائیں۔

یعنی اپنے معاملات کے حل اور اُن کے بارے میں فیصلوں کے لئے طاغوت سے

---

[1] سورہ نساء ٤۔ آیت ٥٩

رجوع کریں، طاغوت سے رائے لیں، اس سے حکم حاصل کریں، اوراسکی رائے کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں۔ان لوگوں کا یہ عمل ایمان کے منافی ہے۔

وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ

جبکہ اُنہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کا انکار کریں۔

وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا. [1]

اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انہیں گمراہی میں دور تک کھینچ کر لے جائے۔

ہمارے خیال میں یہاں شیطان سے مراد کوئی اور چیز نہیں بلکہ خود طاغوت ہے۔

یہ لوگ طاغوت کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، اوراس بات سے غافل ہیں کہ یہ شیطان، جسے قرآن کریم میں طاغوت قرار دیا گیا ہے، انہیں راہِ راست سے دور کرتا ہے، اورانہیں گمراہی کی وادیوں میں دھکیل دیتا ہے۔شیطان انہیں اس راہِ راست سے اس قدر دور کردیتا ہے کہ پھر ان کا اس پر پلٹ کرنا کوئی سان کام نہیں رہتا، بلکہ راہِ راست اور راہِ ہدایت پر واپس نے کے لئے انہیں بہت زیادہ کوشش اورجدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

بعد کا نکتہ ولایتِ خدا کے بارے میں ہے، اورمومنین کی طرف سے اسے قبول کرنے کی بنیاد بھی وہ حکمت ہے جو اسلامی تصورِ کائنات میں مقرر کی گئی ہے۔لہٰذا یہ ایک فطری امر ہے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا کی اطاعت کرنی چاہئے، اورولی امر خدا ہے، اسکی ایک فطری اورواضح حکمت ہے، کیونکہ تمام چیزیں خدا کی ملکیت ہیں، اورآیتِ قرآن "وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ" میں اس نکتے کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔

---

[1] سورہ نساء ٤ ۔ آیت: ٦٠

غیر خدا کی ولایت

اب تک کی گفتگو سے ہم یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ ہر مسلمان اور ہر وہ شخص جو خدا کی بندگی کا دعویدار ہے، اُسے چاہئے کہ اپنا ولی اور فرمانروا اور اپنی پوری زندگی کی تمام سرگرمیوں کا قائد اور مختارِ کُل خدا کی طرف سے متعین شخص کو قرار دے، اپنے آپ کو خداوندِ عالم کے مامور اور مقرر کردہ ولی کے سپرد کرے۔ اللہ کے ولی کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت کرے۔

مختصر یہ کہ اپنی زندگی کی تمام سرگرمیوں کے لئے فقط خداوندِ عالم کو اور ہر اُس شخص کو جسے خدا نے اپنی جانشینی کے لئے منتخب کیا ہے اپنا حاکم اور فرمانروا سمجھے۔

البتہ ہم نے اس نکتے پر بھی گفتگو کی ہے کہ وہ اشخاص جنہیں خدا نے اپنی جانشینی کے لئے منتخب کیا ہے وہ کون لوگ ہیں، اور بتایا ہے کہ پہلے مرحلے میں انبیا علیہ السلام اور انبیا علیہ السلام کے بعد اولیا اس منصب کے حقدار ہیں۔ مختصر یہ کہ ولی اور الٰہی حکمراں یا تو نام اور علامات دونوں کے ساتھ معین ہوتا ہے، یا یہ کہ نام کے ساتھ اس کا تعین نہیں کیا جاتا بلکہ صرف علامات کے ذریعے اسے معین کیا جاتا ہے۔

یہ وہ نکات تھے جنہیں ہم پہلے واضح کر چکے ہیں۔

آج جو نکتہ پیشِ نظر ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی خدا کی ولایت قبول نہ کرے اور غیرِ خدا کی فرمانروائی میں چلا جائے، تو پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسے دمی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس عمل کو کیا کہیں گے؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ اس عمل کا نتیجہ کیا ہوگا؟

البتہ یہ وہ سوالات ہیں جو ولایت کے حوالے سے گفتگو کے دوران سامنے آتے ہیں۔
لیکن جب ہم بحث و گفتگو کے بعد انہیں قبول کرلیں، اور ہمارا ذہن انہیں مان لے، تو پھر اسکے بعد اِن کا شمار اسلام کے ثابت شدہ عملی اصولوں میں ہونے لگے گا۔ اگرچہ اصولِ ولایت کے بارے میں کی جانے والی گفتگو میں یہ مسائل فرعی اور ضمنی نوعیت کے ہیں، لیکن یہ خود اپنی جگہ ایک اصول ہیں۔

قرآن کریم، خدا کی ولایت کے سوا ہر ولایت کو طاغوت کی ولایت قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ: جو کوئی بھی خدا کی ولایت کے تحت نہ ہو، وہ طاغوت کی ولایت کے تحت ہے۔

طاغوت سے کیا مراد ہے؟

لفظ طاغوت کا آمادہ طغیان ہے۔ یعنی سرکشی کرنا اور انسان کی طبیعی اور فطری زندگی کے دائرے سے باہر نکل جانا۔ مثلاً فرض کیجیے کہ انسان حصولِ کمال کے لئے پیدا ہوا ہے، اب جو کوئی انسان کو کامل ہونے سے باز رکھے، وہ طاغوت ہے۔

انسانوں پر لازم ہے کہ وہ خدائی دستور کے مطابق زندگی بسر کریں۔ یہ ایک فطری، طبیعی اور انسانوں کی سرشت کے مطابق بات ہے۔ اب اگر کوئی انسانوں کی نشوونما اس طرح کرے، اُن کے ساتھ ایسا عمل کرے، اور اُن پر ایسا تصرف کرے کہ وہ خدائی دستور کی بجائے کسی اور آئین کے تابع زندگی بسر کریں، تو وہ طاغوت ہے۔

انسان کو اپنے وجود کو مفید اور ثمر ور بنانے کے لئے ہمیشہ جدوجہد اور سعی و کاوش میں مصروف رہنا چاہیئے۔ لہٰذا ہر وہ عمل جو انسان کو غیر سنجیدگی، سستی، کاہلی، عیش کوشی، عافیت طلبی کی ترغیب دے، وہ طاغوت ہے۔

انسانوں کو خدائی فرمان کے تابع ہونا چاہیئے۔ ہر وہ چیز جو انسان کو فرمانِ الٰہی کی اطاعت سے باز رکھے اور انسان کو خدا کے مقابل سرکش بنائے، وہ طاغوت ہے۔

پس طاغوت اسمِ خاص نہیں ہے، اور بعض لوگوں کا یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ طاغوت ایک بت کا نام ہے۔ ہاں، یہ ایک بت کا نام ضرور ہے، لیکن یہ بت کوئی متعین بت نہیں ہے۔ کبھی یہ بت خود آپ ہوتے ہیں، کبھی آپ کا روپیہ پیسہ ہوتا ہے، کبھی یہ آپ کی راحت پسندی کی زندگی ہوتی ہے، کبھی یہ بت آپ کی خواہش ہوتی ہے، کبھی یہ بت وہ شخص ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں آپ اپنا ہاتھ دے کر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اپنا سر جھکا دیتے ہیں تا کہ وہ جہاں چاہے آپ کو لیجائے۔ کبھی یہ بت سونا اور چاندی ہوتے ہیں، کبھی خود انسان بھی ہوتا ہے اور کبھی اجتماعی نظام اور قانون ہوتا ہے۔ پس طاغوت ایک اسمِ خاص نہیں ہے۔

ولایتِ طاغوت اور ولایتِ شیطان

آیت قرآنی سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ } قرآنی اصطلاحات { ملا، مترف، احبار اور رہبان کے مقابل طاغوت ان سے بالاتر مقام ہے۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے، فی الحال ہمیں اس پر گفتگو نہیں کرنی۔ لہٰذا جو کوئی بھی خدا کی ولایت سے خارج ہوا ہے، وہ لازماً طاغوت اور شیطان کی ولایت میں داخل ہوا ہے۔

لیکن شیطان اور طاغوت کے درمیان کیا باہمی نسبت ہے؟

ان کے درمیان پائی جانے والی وابستگی نسبت سے بڑھ کر ہے۔ شیطان طاغوت اور طاغوت شیطان ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ

اہل ایمان راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ

اور کفار طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں ہے۔

اسکے بعد فرماتا ہے:

فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا. [1]

لہٰذا تم شیطان کے ساتھیوں سے جہاد کرو، بے شک شیطان کا مکروفریب بہت کمزور ہوتا ہے۔

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ شیطان کی جگہ طاغوت اور طاغوت کی جگہ شیطان کا نام لیا گیا ہے۔پس شیطان بھی ایک ایسا عنصر ہے جو دمی کو اسکے وجود کے باہر سے شرارت میز اور فساد انگیز کاموں، انحطاط، تسلیم، ذلت، ظلم، بدی اور گمراہی پر ابھارتا ہے۔

شیاطینِ انس بھی ہیں اور شیاطینِ جن بھی پائے جاتے ہیں۔ایسے شیاطین بھی ہیں جو عزیز رشتے داروں، بیویوں اور باؤاجداد سے تعلق رکھتے ہیں۔شیطان کا ایک مصداق اور نمونہ ابلیس ہے،جس نے دم صفوۃ ا کے خلاف پرچم بلند کیا، اور وہ باتیں کیں جن کا ذکر ہم سنا کرتے ہیں۔ہم اور پ اپنی پوری عمر جس شیطان کو لعنت کرتے ہیں، وہ یہی بیچارہ اوّلین شیطان ہے، جبکہ شیطان صرف وہی نہیں ہے۔شاید وہ پہلا اورخری شیطان نہ ہو۔دنیا میں بہت سے شیاطین ہیں جو محسوس بھی کئے جاسکتے ہیں، ہاتھوں سے بھی،نکھوں سے بھی اور کبھی کبھی یہ انسان کے معاصر بھی ہوتے ہیں۔مجموعی طور پر ولایتِ الٰہی کے سوا ہر ولایت شیطانی اور طاغوتی ولایت ہے۔

ایک ایسا شخص جو حقیقی ولی کی حاکمیت میں زندگی بسر نہیں کرتا، اسے یہ بات پتا ہونی چاہئے کہ پھر وہ طاغوت اور شیطان کی حاکمیت میں زندگی گزار رہا ہے۔

---

[1] سورہ نساء ٤ ۔آیت ٧٦

ممکن ہے آپ پوچھیں کہ شیطان اور طاغوت کی حاکمیت میں زندگی بسر کرنے اور اسکے احکام وفرامین پر سر جھکا دینے میں کیا خرابی ہے؟

یہ بھی آیت میں پیشِ نظر نکات میں سے ایک نکتہ ہے۔قرآن مجید اس بارے میں ہمیں چند جواب دیتا ہے۔ پہلا جواب یہ ہے کہ اگر آپ نے شیطان کی ولایت قبول کی،تو شیطان آپ کے وجود میں پائی جانے والی تمام تعمیری،تخلیقی اور مفید قوتوں پر مسلط ہوجائے گا۔اگر آپ نے شوق ورغبت کے ساتھ شیطان اور طاغوت کی حاکمیت کا طوق اپنے گلے میں پہن لیا،تو پھر آپ اس سے نجات حاصل نہ کرسکیں گے، چاہے آپ کے وجود میں کتنی ہی تعمیری اور تخلیقی قوتیں اور صلاحیتیں پائی جاتی ہوں۔آپ پر طاغوت اور شیطان قابض ہوجائے گا، اور جب آپ کا پورا وجود اسکے قبضے میں چلا جائیگا،تو وہ آپ کو اس راستے پر جس پر وہ چاہتا ہے، اور اس وسیلے سے جو اسے پسند ہے کھینچ لئے جائے گا اور ظاہر ہے کہ شیطان اور طاغوت انسان کی رہنمائی نور، معرفت،سائنس،رفاہ اور معنویت کی جانب نہیں کرے گا۔اسکے لئے یہ چیزیں ہدف اور مقصد کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ شیطان اور طاغوت کے لئے اس کے شخصی اور ذاتی مفادات اوّلین ہدف اور مقصد ہیں، اور وہ ان کا حصول چاہتا ہے۔پس وہ آپ کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرے گا۔

اگر آپ ہمارے عرض کئے ہوئے اِن چند جملوں پر غور کریں،تو دیکھیں گے کہ ان تمام جملوں کے بین السطور میں ایک مفہوم پوشیدہ ہے جس کی تاریخی حقائق سے تصدیق ہوتی ہے۔

اگر آپ نے طاغوت کی ولایت قبول کرلی،تو آپ کی تمام قوتیں اور تخلیقی صلاحیتیں طاغوت کے قبضے میں چلی جائیں گی، اور اس صورت میں پھر وہ آپ کے کسی کام کی نہیں رہیں گی۔شیطان کے پیشِ نظر خود اس کی اپنی ذات اور اپنے مفادات ہوتے ہیں۔اگر آپ اسکی راہ

پر چل پڑے، تو وہ آپ کو اپنے فوائد اور مفادات کی بھینٹ چڑھا دے گا، اور گمراہی کی طرف کھینچ لے جائے گا۔ قدرت وطاقت اسکے اختیار میں ہے اور کیونکہ آپ نے اپنے آپ کو اسکے سپرد کردیا ہوگا، لہٰذا وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق آپ کو لئے پھرے گا۔

حلقہ ای درگردنم افکندہ "دوست"

می کشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

"دوست" نے میری گردن میں ایک طوق ڈال دیا ہے، اور جہاں اُس کا دل چاہتا ہے مجھے گھسیٹے پھرتا ہے۔

سورہ نسا کی درجِ ذیل آیت انتہائی قابلِ توجہ اور غور وفکر کے لائق ہے:

وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى[1]

اور جو راہِ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور اہل ایمان کے راستے کے خلاف چلے، تو ہم اسے ادھر ہی جانے دیں گے، جدھر وہ گیا ہے (ہم اسے کرنے دیں گے جو کچھ وہ کرتا ہے)۔

جو کوئی بھی راہِ حق واضح ہونے کے بعد، رسولِ خدا کی مخالفت کرے گا، پیغمبر سے جدا ہوگا اور اپنی راہ کو راہِ نبوت (وہی راہ جس کے بارے میں ہم نے پہلے آپ کو بتایا ہے) سے جدا کرے گا اور مومنین اور اسلامی معاشرے اور ایمانی مقاصد سے ہٹ کر کوئی اور راہ اختیار کرے گا، وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے گروہ سے علیحدہ کرلے گا۔ پھر ہم اُسی طوق کو جسے خود اُس نے اپنی گردن میں ڈالا ہے، اُسکی گردن میں اور مضبوط کردیں گے۔ وہی ولایت جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں قبول کیا ہے، اور جس حلقے میں وہ خود اپنے قدموں سے چل کر گیا ہے، اور جسے اُس

---

[1] سورہ نساء۔ آیت

نے اپنا مسکن بنایا ہے، ہم اسے وہیں پھنسا دیں گے۔ کیونکہ یہ قرآن "اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ" [۱] (اور خدا کسی قوم کے حالات کو اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدل لے) کے مطابق تم نے اپنی لگام شیطان کے ہاتھ میں دے دی ہے، پس اس لگام کو شیطان ہی کے ہاتھ میں رہنے دو، یہ خدا کی سنت ہے، یا قانونِ خلقت ہے۔

اس آیت میں یہاں تک اِس دنیا سے متعلق تھا، آگے چل کر آیت اُس دنیا (آخرت) کے بارے میں کہتی ہے کہ:

وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۖ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا۔ [۲]

اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے جو بدترین ٹھکانہ ہے۔

یہاں سے وہ سیدھا دوزخ میں جائے گا اور پروردگار کے قہر اور خدا کے دائمی عذاب کا مزا چکھے گا۔

جب انسان تاریخ پر نظر دوڑاتا ہے، تو دیکھتا ہے کہ بالکل ایسا ہی ہے۔ یہ بات بہت اہم اور انتہائی اہم ترین اجتماعی مسائل میں سے ہے۔ ان مسائل پر قرآن کے نکتۂ نظر کے بارے میں ہمارا کام بہت کم ہے، اور ہم نے انہیں تاریخِ اسلام سے بہت کم منطبق کیا ہے۔ کتنا اچھا ہو اگر قرآن کریم سے شغف رکھنے والے اور اجتماعی مسائل اور خصوصاً قرآن کے تاریخی مسائل میں غور وفکر کرنے والے افراد ان مسائل میں زیادہ سے زیادہ غور وخوض کریں اور اُنہیں تاریخی حقائق پر منطبق کریں۔

اس آیت کی تفسیر واضح کرنے کی غرض سے، آج ہم آپ کے سامنے کچھ تاریخ بیان

---

[۱] سورہ رعد ۱۳۔ آیت ۱۱

[۲] سورہ نساء ٤۔ آیت ۱۱٥

کرنا چاہتے ہیں۔

کوفی معاشرے کا جائزہ

کوفہ کا شمار تاریخ اسلام کے انتہائی عجیب شہروں میں ہوتا ہے۔آپ کے ذہن میں کوفہ سے متعلق کئی قسم کی باتیں ہوں گی۔ جو کچھ ہم بیان کریں گے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

کوفہ وہ شہر ہے جسے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دار الخلافہ کے لئے منتخب کیا، جبکہ اُس زمانے کی عظیم اسلامی مملکت میں اور دوسرے شہر بھی موجود تھے۔ یہ کوفہ کا ایک امتیاز ہے۔ اس شہر کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اہل کوفہ نے امیر المومنین علیہ السلام کا ساتھ دیتے ہوئے متعدد جنگوں میں آپ کے ہمراہ شرکت کی۔ یہ جنگِ جمل میں شامل رہے، جنگِ نہروان میں حصہ لیا، جنگِ صفین میں بھی کوفہ کے اطراف کے قبائل، یہاں کے جنگجو افراد اور بعض دوسرے قبائل شامل تھے۔

پھر یہی کوفی تھے جن سے امیر المومنین علیہ السلام شکوہ کیا کرتے تھے۔آپ ان سے گلہ کیا کرتے تھے کہ جب میں تم سے جنگ کے لئے نکلنے کو کہتا ہوں، تو تم کیوں نہیں نکلتے۔ اسکے بعد یہی کوفہ تھا جس کے بزرگوں نے خط لکھا اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خدمت میں گئے اور اُن سے کہا کہ: آقا! چلے آیئے، ہم اس شہر کو پ کے حوالے کرتے ہیں۔لیکن امام حسن علیہ السلام وہاں تشریف نہ لائے۔ پھر یہی شہر تھا جس کی ممتاز شخصیت نے حسین ابن علی علیہما السلام کے نام خط لکھا کہ

اِنَّهُ لَيۡسَ عَلَيۡنَا اِمَامٌ.

ہمارا کوئی امام اور پیشوا نہیں ہے، ہمارا کوئی حاکم و رہنما نہیں ہے، اور اب جبکہ خدا نے

اس طاغوت کو نابود کر دیا ہے، آپ چلے یئے۔ سلیمان ابن صرد، حبیب ابن مظاہر، مسلم ابن عوسجہ، وغیرہ جیسے یہ لوگ سچ کہہ رہے تھے۔

پھر یہی اہل کوفہ تھے جو ایک انتہائی غیر مساوی جنگ میں حسین ابن علی علیہ السلام کے مقابل صف را ہو گئے اور کربلا کا المیہ وجود میں یا۔

کچھ ہی عرصے بعد انہی لوگوں کے ہاتھوں ایک ایسا تاریخی واقعہ ظہور میں یا جس کا شمار تاریخ اسلام کے انتہائی نادر اور پر شکوہ واقعات میں ہوتا ہے اور وہ توابین کا واقعہ ہے، جنھوں نے توبہ کی غرض سے اور عاشورا کے واقعے میں امام حسین علیہ السلام کی مدد کو نہ پہنچ سکنے کی تلافی کے لئے اپنی جانیں فدا کرنے کی خاطر قیام کیا۔ پھر یہی شہر تھا جس میں بنی امیہ اور بنی عباس کے خلاف اکثر انقلابات کے بیج بوئے گئے، جو پھلے پھولے اور سرسبز ہوئے۔ ان لوگوں نے بے انتہا قربانیاں دیں، بے حساب مارے گئے، بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

پھر انہی اہل کوفہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے بعض مواقع پر سُستی، کمزوری اور بزدلی کا مظاہرہ کیا۔

اسکی کیا وجہ ہے؟

کیا ان افراد کی دو روحیں اور دو چہرے تھے؟!

کوفے کے بارے میں شناسائی ایک اہم مسئلہ ہے۔

ہمارے خیال میں کوفہ کا مطالعہ اور تاریخ کے مختلف ادوار میں اہل کوفہ کی نفسیات کا جائزہ انتہائی دلچسپ بحث ہوگی۔ جو لوگ اس کام کی لیاقت رکھتے ہیں، ماہرین، معاشرہ شناس اور نفسیات داں، اُنہیں چاہئے کہ وہ بیٹھیں اور کوفہ کے بارے میں گفتگو کریں، سوچ بچار کریں، بحث کریں اور دیکھیں کہ یہ کیسا عجیب مقام ہے جہاں ایک موقع پر انتہائی حیرت انگیز عظیم انسانی کمالات کا مظاہرہ ہوتا ہے اور دوسرے موقع پر اس قدر بے ضمیری، کمینگی، سستی، کاہلی اور

ذلت کا۔

ایسا کیوں ہے؟

کوفہ وہ شہر ہے جس کے افراد کی تربیت امیر المومنین علیہ السلام کے متین اور بلیغ کلمات کے سائے میں ہوئی ہے، آپ ہی نے اُن کی شخصیتوں میں نکھار پیدا کیا ہے، لہٰذا تاریخِ تشیع کے اکثر عظیم اور جری افراد اسی شہرِ کوفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حتیٰ ان کی تعداد مدینہ سے تعلق رکھنے والے افراد سے بھی زیادہ ہے۔ اسکی وجہ امیر المومنین علیہ السلام کی (مدتِ خلافت کے دوران) چند سالہ تعلیمات اور تلقینات ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام جیسی ہستی کا اِس شہر پر حکومت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چار سال کے عرصے میں عالمِ اسلام کی سطح پر یہ حکومت ناکامی سے دوچار ہوئی تھی، لیکن شہرِ کوفہ کی سطح پر یقینی طور پر کامیاب رہی تھی اور قطعی طور پر اس نے حیرت انگیز اور عجیب اثرات مرتب کئے تھے، اور کوفہ کو شیعیت کا گہوارہ اور شیعی خصوصیت اور فضیلتوں کی زادگاہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ البتہ ہر وہ مقام جو اعلیٰ صفات اور فضیلتوں کی جائے پیدائش ہو، ضروری نہیں کہ وہاں رہنے والے تمام افراد اُن صفات کے مالک، با فضیلت اور آئیڈیل ہوں۔

ہمیشہ ہی جوش وخروش سے بھرپور نظر آنے والے معاشرے میں لوگوں کا صرف ایک طبقہ معاشرے کے اس جوش وخروش کا ترجمان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی جگہ بسنے والے لاکھوں افراد میں سے صرف چند ہزار انسان مجاہدانہ عمل انجام دیتے ہیں، جس کی وجہ سے مجاہدت اور ولولہ فرینی کے لئے اس جگہ کا نام دنیا میں معروف ہو جاتا ہے۔

کوفہ میں بھی انتہائی اچھے لوگوں پر مشتمل صرف ایک گروہ تھا، وگرنہ وہاں کے عام افراد دوسری جگہوں کے لوگوں ہی کی طرح تھے، ایسا نہ تھا کہ اُن سے بدتر ہوں، مشہد کے لوگوں کی طرح، تہران کے لوگوں کی طرح، اصفہان کے لوگوں کی طرح، مدینہ کے لوگوں کی طرح،

دوسرے علاقوں کے لوگوں کی طرح۔ لیکن مملکتِ اسلامی کے اس گوشے (یعنی کوفہ) میں یہ مختصر گروہ اُس زمانے کی حکومتوں کے لئے خوف اور وحشت کا سبب تھا، اس لئے وہ حکومتیں ہمیشہ بد ترین عناصر، کمین ترین گورنروں، پست ترین دمیوں اور اپنے نوکروں اور جلادوں کو اس شہر میں تعینات کیا کرتی تھیں، اور وہ لوگوں کے خلاف ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کر کے، زہریلا پروپیگنڈا کر کے اور اُن کے درمیان فقر اور بیچارگی کورواج دے کر اِس شہر کے لوگوں سے ایسا سلوک کرتے تھے کہ وہ لوگ لاشعوری طور پر، بے سوچے سمجھے انتہائی شوق اور رغبت کے ساتھ بُرائیوں اور پستیوں کی طرف قدم بڑھائیں۔

اہل کوفہ کے ساتھ یہ سلوک اس لئے تھا کہ دوسرے شہروں کے برخلاف یہاں ایک مبارز اور ممتاز گروہ پایا جاتا تھا، اور ان حکومتوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ معاون و مساعد خصوصیت جن سے یہ پاک طینت، بزرگ منش اور مجاہد گروہ فائدہ اٹھا سکتا تھا، انہیں وہاں کے لوگوں میں سے مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا وہ زہریلا پروپیگنڈا کیا کرتے تھے، لوگوں کو دباؤ اور گھٹن کے ماحول میں رکھتے تھے، انہیں دنیاوی اعتبار سے کمزور کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ طرح طرح کے ذرائع اختیار کر کے شہرِ کوفہ کے لوگوں پر دباؤ ڈالتے تھے۔ دوسرے شہروں کے یہ حالات نہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ ظالم و جابر اور فریب کار حکومتوں کی سرگرمیوں کے زیر اثر کوفہ سے تعلق رکھنے والے عوام الناس کے ہاتھوں ناشائستہ اعمال انجام پاتے تھے۔ البتہ اِن بُرائیوں کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ اس شہر کے لوگ ہی بُرے تھے۔

بہر حال یہ کوفہ کے بارے میں ایک مختصر وضاحت تھی۔ اگر کچھ لوگ اسکی تاریخ کا مطالعہ کریں، اور اس پر سوچ بچار کریں، تو بہت سی دلچسپ چیزیں اُن کے علم میں آئیں گی۔

اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان جانتا تھا کہ کوفہ کے انقلابی اور جنگجو لوگوں سے حجاج بن یوسف کے سوا کوئی اور نہیں نمٹ سکتا۔ لہٰذا اُس نے اپنے جلاد ترین اور پست ترین نوکر حجاج بن

یوسف کوکوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ حجاج بن یوسف دھی رات کے وقت شمشیر زن افراد کے ایک گروہ کے ساتھ کوفہ میں داخل ہوا۔ کسی کو اُس کی مد کی خبر نہ ہوسکی۔ کوفہ کے لوگوں نے اپنے سابقہ حاکم کو بظاہر کوفہ سے باہر نکال دیا تھا، یا اسے عضوِ معطل بنا دیا تھا۔ حجاج دھی رات کے وقت کوفہ میں داخل ہوااور فوراً مسجد کا رخ کیا۔ اُس دھی رات کے وقت مسجد میں نمازیوں، تہجد گزاروں اور مقدس افراد کے زمزمیسنائی دے رہی تھیں۔

وہاں پہنچ کر سب سے پہلے اُس نے اپنے غلاموں اور نوکروں کو ضروری ہدایت دیں۔ ہر ایک کو ایک مخصوص مقام پر متعین کیا اور خود اس انداز سے مسجد میں داخل ہوا کہ کسی کو معلوم نہ ہوسکے، پھر بغیر کسی کو متوجہ کئے، اچانک لوگوں کے درمیان سے اٹھا اور منبر پر جا بیٹھا۔

کیونکہ مسجدِ کوفہ بہت بڑی ہے، اس لئے پہلے تو لوگ متوجہ ہی نہ ہوئے، لیکن رفتہ رفتہ بعض لوگوں نے دیکھا کہ عجیب حالت بنائے ایک شخص خاموشی کے ساتھ منبر پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس موقع پر حجاج نے سر پر سرخ رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی اور اُس کا ایک سرا کھول کر اُسے ڈھاٹے کی سی صورت میں ناک تک لپیٹ رکھا تھا۔ اس حالت میں اُسکی صرف آنکھیں نظر رہی تھیں اور وہ ایک عجیب سی چیز لگ رہا تھا۔

تصور کیجئے تلوار سے مسلح ایک شخص، سرخ رنگ کی عبا اور پگڑی پہنے ہوئے اس انداز سے مسجدِ کوفہ کے منبر پر خاموش بیٹھا ہے۔ اچانک ایک شخص سر اٹھاتا ہے تو اسکی نظر اُس فرد پر پڑتی ہے جو اس عجیب صورت سے منبر پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ شخص اپنے قریب بیٹھے ہوئے دمی سے پوچھتا ہے: یہ کون ہے؟ رفتہ رفتہ وہاں موجود ہر فرد ایک دوسرے سے یہی سوال کرتا ہے۔ آخر تمام لوگوں کی سرگوشیاں، جو علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے، گونجنے لگتی ہیں، اُن کی توجہ مبذول ہونے لگتی ہے اور وہ منبر کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے، آیتِ قرآن کیا کہہ رہی ہے: نُوَلِّہ مَا تَوَلّٰی۔ وہ شخص جو ایمان اور مومنین

کی راہ سے ہٹے گا، ہم اسکی گردن میں پڑے طوق کو اور مضبوطی سے کس دیں گے۔

تم جو مسلمان تھے، اور تم نے دیکھا تھا کہ تمہاری مسجد کے منبر پر ایک ایسا دمی بیٹھا ہوا ہے جسے تم نہیں جانتے۔ آخر تم کیوں یہ دیکھنے کے باوجود خاموش بیٹھے رہے؟ تمہیں چاہیئے تھا کہ قریب جا کر اس سے پوچھتے کہ تم کون ہو؟ اپنا تعارف کراؤ۔ اسی طرح دوسرا دمی، تیسرا دمی کرتا اور سب کے سب افراد اس سے یہی سوال پوچھتے۔ اگر تمام لوگ اس سے یہ سوال کرتے، تو صورتحال بدل جاتی۔ لیکن ان لوگوں نے سستی کا مظاہرہ کیا، بے حوصلہ ہونے اور بزدلی کا مظاہرہ کیا اور اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ وہ خود کوئی گفتگو کرے۔

جب حجاج نے دیکھا کہ تمام افراد کا رُخ اسی کی طرف ہے، تو بولا: میرا خیال ہے کہ اہل کوفہ مجھے پہچانتے نہیں ہیں۔

لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اُسے نہیں پہچانتے۔

حجاج نے کہا: چلو، میں خود تم سے اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں۔ اس نے اپنے سر سے پگڑی اُتاری، ڈھاٹے کو بھی ہٹایا، لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی اور یہ عربی شعر پڑھا:

اَنَابْنُ جَلَاوَطَلَاعِ الثَّنَایَا

اِذَانَزَعَ الْعَمَامَۃَ تَعْرِفُونِی

"جب میں اپنی پگڑی اتاروں گا تو تم مجھے پہچان لوگے۔"

کیونکہ حجاج ایک مرتبہ پہلے بھی کوفہ آچکا تھا، لہٰذا ایک دو افراد نے کہا کہ ہمارے خیال میں یہ حجاج ہے اور پھر حجاج، حجاج کی سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ جب اُن پر واضح ہوگیا کہ اُن کے سامنے منبر پر حجاج بیٹھا ہے، تو وہ خوف اور دہشت کا شکار ہوگئے۔ یہ دیکھ کر حجاج نے کہا: ہاں، تم لوگوں نے صحیح پہچانا ہے، میں حجاج ہوں۔

لوگوں پر رعب طاری ہوگیا، اُن میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ سوچا کہ حجاج میری ہی

طرح کا ایک انسان ہے، بس فرق یہ ہے کہ وہ اوپر جا بیٹھا ہے اور میں نیچے ہوں، جو کچھ اُسکے پاس ہے وہ میرے پاس بھی ہے۔لوگ بزدلی کا شکار ہو گئے۔

حجاج نے کہا: اے اہل کوفہ! میں تمہاری گردنوں پر ایسے سر دیکھ رہا ہوں، جن کے پکے ہوئے پھلوں کی طرح اتارے جانے کا وقت گیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان تنوں سے کچھ سر جدا ہونے چاہئیں۔

لوگ یہ کھوکھلی باتیں سن کر مزید مرعوب ہو گئے۔آخر حجاج ایٹم بم لے کر تو کوفہ نہیں آیا تھا؟ اگر اُسکے پاس ایٹم بم ہوتا بھی، تو وہ اسے پھاڑ تو سکتا نہ تھا۔ کیونکہ اگر وہ اسے پھاڑتا، تو کوئی باقی نہ بچتا جس پر وہ حکومت کرے۔ضروری تھا کہ کچھ لوگ زندہ رہیں، سب کو تو نہیں مار ڈالتا۔ اگر وہ سب کو مار ڈالتا، تو پھر حکومت کس پر کرتا؟ در و دیوار پر تو حکومت ہو نہیں سکتی۔

لیکن لوگوں نے یہ بات نہیں سوچی۔

حجاج یہ جملہ کہنے کے بعد کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ گردنوں پر موجود کچھ سروں کو اُتار لینے اور انہیں تن سے جدا کر دینے کا وقت پہنچا ہے، بولا: اب میں فیصلہ کروں گا کہ کس کا سر اُتارنا چاہئے۔اس نے اپنے غلام کو آواز دی۔اس کا غلام کھڑا ہوا۔حجاج نے کہا کہ اِن لوگوں کو امیر المومنین کا خط پڑھ کر سناؤ۔آپ جانتے ہیں کہ اس نے عبدالملک بن مروان کو امیر المومنین کہا تھا۔غلام نے عبدالملک بن مروان کا خط کھولا اور اسے پڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔اس خط کا غاز اس جملے سے ہوا تھا:

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ اَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ مَرْوان عَلٰى اَهْلِ الْكُوفَةِ۔ يَا اَهْلَ الْكُوفَةِ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ امیر المومنین عبدالملک بن مروان کی جانب سے اہل کوفہ کے لئے۔اے اہل کوفہ! تم پر سلام ہو۔

جب غلام یہاں تک پڑھ چکا، تو اچانک حجاج نے اُس کی طرف رخ کیا اور کہا: خاموش ہوجاؤ، چپ ہوجاؤ۔ اسکے بعد اُس نے اہل کوفہ کو مخاطب کیا اور کہا: تم بہت بدتہذیب ہوگئے ہو، امیرالمومنین تمہیں سلام کرتے ہیں اور تم اُن کے سلام کا جواب نہیں دیتے؟!

غلام! دوبارہ پڑھو۔

غلام نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا:

مِنْ اَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ مَرْوان عَلٰی اَهْلِ الْكُوفَةِ۔

يَا اَهْلَ الْكُوفَةِ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ۔

یہ سنتے ہی پوری مسجد سے صدا بلند ہوئی:

وَ عَلٰی اَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ السَّلَام۔

سلام کا یہ جواب سن کر حجاج کے لبوں پر پسندیدگی کے اظہار سے بھرپور ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے دل میں کہا کہ بس کام ہوگیا اور واقعاً اہل کوفہ کا کام تمام ہوگیا۔ انہوں نے امیرالمومنین کے سلام کا جواب دیا، جو درحقیقت امیرالکافرین اور امیرالفاسقین تھا۔ یعنی اِن لوگوں نے حجاج کو قبول کرکے دراصل اپنا کام تمام کرلیا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى۔ [1]

اب جبکہ تم نے اس کا جواب دے دیا، اور اسکی تائید کردی ہے، تو حجاج تمہارا حکمراں ہوا، تم نے حجاج کے لئے دروازہ کھول دیا ہے۔ خدا تو معجزے کے ذریعے حجاج کو ختم کرکے اُس کی جگہ امام زین العابدین علیہ السلام کو نہیں بٹھائے گا۔ اب حجاج تمہارا حکمراں ہوا، اور جب تک تم حجاج سے نفرت کا اظہار کرکے اُسے حکمرانی سے بے دخل نہ کردو، اُس وقت تک تمہاری پوری زندگی،

---

[1] سورۂ نساء: ۱۱۵

سوچ اور روح حجاج کے اختیار میں رہے گی۔ یہ کائنات کی سنت ہے، یہ سنتِ تاریخ ہے۔

خط پڑھے جانے کے بعد حجاج منبر سے نیچے اُترا، دارلامارہ گیا اور وہاں جا کر کہا: کیونکہ اہل کوفہ میں سے کچھ لوگوں نے ایک باغی اور مداخلت کار بظاہر محمد بن اشعث } مراد ہے { کا ساتھ دیا ہے، لہٰذا تمام اہل کوفہ آئیں اور اعتراف کریں کہ وہ کافر ہو گئے تھے، اور دوبارہ مومن بنیں۔

تمام اہل کوفہ (یعنی ہوا کے رُخ پر چلنے والے تمام عوام الناس، وگرنا یقینی طور پر ایسے خواص بھی تھے جو ایسا کرنے پر تیار نہیں ہوئے، اِن میں سے کچھ لوگ گھروں ہی میں رہے، کچھ نے تلواریں کھینچ لیں یا دوسرے طریقے اختیار کئے) گروہ در گروہ اپنے کفر کا اقرار کرنے کے لئے دارلامارہ کی طرف چل پڑے۔ (وہاں پہنچ کر) انہیں کرنا یہ تھا کہ پہلے اس بات کا اقرار کریں کہ وہ دین خدا سے خارج ہو گئے ہیں اور دائرہ اسلام سے باہر نکل گئے ہیں۔ یہ اقرار کرنے کے بعد توبہ کریں اور کہیں کہ اب جب ہم نے توبہ کر لی ہے، تو انشاء اللہ امیر ہماری توبہ قبول کریں گے، تا کہ ہم مسلمان ہو جائیں۔

ایک بوڑھا شخص حجاج کے پاس گیا۔ حجاج نے دیکھا کہ اس شخص میں کچھ حد تک ن پائی جاتی ہے۔ بولا: بڑے میاں! یوں محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے کفر کے بارے میں شک ہے۔ ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ اگر تمہیں شک ہے تو میں تمہیں تلوار سے اسکی سزا دیتا ہوں۔ کیونکہ جو کوئی بھی اپنے کفر کا اقرار نہیں کرتا تھا، وہ مارا جاتا تھا۔ بوڑھے نے فوراً جوب دیا: نہیں نہیں جنابِ عالی، میں تو تمام کفار سے زیادہ کافر ہوں۔

یہ تاریخ ہے۔ تاریخ درس ہے۔

خوشتر ان باشد کہ وصف دلبران
گفتہ ید در حدیث دیگران

تاریخ تفسیر قرآن ہے،قرآن کو تاریخ میں تلاش کیجئے۔جان لیجئے کہ:

مردخرد مند جہان دیدہ را
عمر دوبا یست درا ین روزگار
تا بہ یکی تجربہ اندوختن
با دگری تجربہ بردن بہ کار

تاریخ ہمارا ماضی ہے۔تاریخ میں غوروفکر کیجئے۔تاریخ سے شغف پیدا کیجئے اور جو کچھ تاریخ میں پوشیدہ ہے، اُسے دریافت کرنے کی کوشش کیجئے۔صرف قصیدہ سرائی اور داستانیں بیان کرنے پر اکتفا نہ کیجئے، بلکہ دیکھئے کہ تاریخ ہمیں کیا سبق دینا چاہتی ہے۔حجاج کا قصہ ہم سے کیا کہتا ہے؟ یہ بتا دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ یہی حجاج، انہی لوگوں کے ہاتھوں دردناک ترین طریقے سے مارا گیا جن کے لئے اُس نے لوگوں پر یہ مظالم ڈھائے تھے۔یہ حقیقت جاننے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ

مَنْ اَعَانَ ظَالِماً سَلَّطَهُ اللهُ عَلَيْهِ [1]

جو کوئی ظالم کی مدد کرتا ہے،تو خدا اسی ظالم کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔

یہ بھی ایک سنت ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کیجئے،

دیکھئے کہ اِس میں ہمارے لئے کیا کیا سبق موجود ہیں؟

اِس میں ہمارے لئے کیا کیا ہدیتیں ہیں؟

اِس میں ہمارے لئے کیا کیا پیغام،

---

[1] الخرائج و الجرائح / ج3 / 1058 / باب فی مقالات من یقول بصحة النبوة منهم علی الظاهر و من لا یقول و الکلام علیهما ..... ص: 1054

کیا کیا نصیحتیں پائی جاتی ہیں؟

انتہائی غور وفکر کے ساتھ تاریخ کا جائزہ لیجئے۔تب آپ دیکھیں گے کہ ہمارے لئے یہ قرآن کے معنی بیان ہورہے ہیں۔

ہم نے تاریخ کے اُس حصے کے متعلق عرض کیا ہے۔حال کا اِس سے ارتباط اور اِس سے تعلق پیدا کرنا خود آپ پر چھوڑا ہے۔ہم اسی مقام سے آیتِ قرآنی کی طرف واپس پلٹتے ہیں، اور سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہیں:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ [1]

جب قرآن کو پڑھ لیا تو شیطان مردود کے ضرر سے خدا کی پناہ طلب کیجئے۔

اب جب کہ تم نے قرآن کو پڑھ لیا ہے اور معارفِ اسلامی کو سیکھ لیا ہے، تو اپنے آپ کو شیطان کے ضرر سے خدا کی امان میں لے جاؤ۔شیطان جو چاہتا ہے کہ تم قرآن کو نہ جانو، اُسے نہ سمجھو۔یعنی اس بات کی کوشش کرو کہ تمہیں حاصل ہونے والی قرآن کی معرفت، تم سے شیطان چھین نہ لے، اور تم پر راہِ عمل اور اسکی مزید فہم کے راستے بند نہ کردے۔لہٰذا شیطانِ مردود کے شر سے بچنے کے لئے خدا کی پناہ میں چلے آؤ۔

اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔ [2]

بے شک فساد پیدا کرنے والا شیطان ہرگز اُن لوگوں پر غلبہ نہیں پاسکتا جو صاحبانِ ایمان ہیں اور جن کا اللہ پر توکل اور اعتماد ہے۔

وہ لوگ جو اپنے آپ کو خدا کی ولایت کے زیرِ سائے رکھتے ہیں اور ولایت اللہ کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں، شیطان ان پر تسلط نہیں رکھتا۔

---

[1] سورہ نحل ۱۶۔آیت ۹۸

[2] سورہ نحل ۱۶۔آیت ۹۹

إِنَّمَا سُلْطَنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ

بے شک شیطان کا غلبہ صرف اُن لوگوں پر ہوتا ہے جو اُسکی ولایت قبول کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے گلے کی رسی خود اپنے ہاتھوں سے اسکے حوالے کی ہے:

إِنَّمَا سُلْطَنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ

یعنی شیطان کا غلبہ اور تسلط صرف اُن ہی لوگوں پر ہوتا ہے اور اُس کا بس فقط اُن ہی لوگوں پر چلتا ہے جو اُسکی ولایت قبول کر لیتے ہیں۔

وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ.[1]

اوران لوگوں پر ہوتا ہے جو اللہ کے بارے میں شرک کرتے ہیں۔

اور جیسا کہ ہم نے پہلے سورۂ نسا میں کہا ہے کہ:

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ

ایسا شخص جو پیغمبر کے ساتھ لڑائی کرے اوران سے جدا ہو

مِنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى

اپنے سامنے راہِ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد۔

وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيلِ الْمُؤۡمِنِينَ

اور مومنین کی راہ کے علاوہ کسی اور راہ کی پیروی کرے۔

نُوَلِّهِۦ مَا تَوَلَّىٰ

تو اُس نے جس کسی چیز اور جس کسی شخص کی ولایت کو قبول کیا ہوا ہے،

ہم اسی کو اس کا ولی اور فرمانروا بنا دیتے ہیں۔

---

[1] سورہ نحل ۱٦۔آیت ۱۰۰

وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا.[1]

اور اسے دوزخ میں اٹھا پھینکتے ہیں، اور یہ کیسا بُرا انجام ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ.

خدا اپنا شریک بنانے والے شخص کو معاف نہیں کرتا۔

یہاں، توحید اور شرک کے معنی کی جانب واپس آتے ہیں، تا کہ دیکھیں کہ شرک کیا ہے؟ توحید کیا چیز ہے؟ اور جس گناہ سے خدا درگزر نہیں کرتا وہ کیا ہے؟

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ.

خدا کسی ایسے شخص کو معاف نہیں کرتا جس نے ولایت میں شرک کو قبول کیا ہوا ہو۔

ایسا شخص جو مشرک ہو گیا ہے، جس نے خدا کی حاکمیت کا دائرہ غیر خدا کے سپرد کر دیا ہے، اُس کا وہ زخم جو اس گناہ و نافرمانی، بُرائی اور بدبختی کی وجہ سے اُسکی روح پر لگا ہے، کبھی نہیں بھرے گا۔ یعنی وہ ہرگز مغفرت نہیں پائے گا۔ غفرانِ گناہ، یعنی نافرمانی، خطا، لغزش اور گمراہی کے نتیجے میں انسان کی روح پر لگنے والے زخم کا بھر جانا اور اس زخم کے بھر جانے سے مراد یہ ہے کہ اُسے خدا کی طرف سے مغفرت اور غفران مل گئی ہے۔ اگر تم غیر خدا کی ولایت میں ہوئے، تو اس گناہ کا داغ اور دھبّا کسی صورت دور نہ ہوگا۔

وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ

لیکن اگر انسان چاہے تو شرک سے کمتر اور اس سے نچلے درجے کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

البتہ خدا اس شخص کی مغفرت کر دے گا جو توبہ اور تلافی کرے اور خدا کی طرف واپس

---

[1] سورہ نساء ٤۔ آیت ١١٥

پلٹ ئے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا.[1]

"اور جوکوئی خدا کا شریک قرار دے گا وہ راہِ ہدایت سے بہت دور اور گمراہ ہو گیا ہے۔"

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی بیابان میں راستے سے بھٹک جاتے ہیں، لیکن صحیح راستے سے صرف ایک کلومیٹر دور ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ صحرا میں راستہ گم کر بیٹھتے ہیں اور مطلوبہ راستے سے دسیوں کلومیٹر دور چلے جاتے ہیں، اتنے دور کہ پلٹ کرنا سان کام نہیں رہتا، اور اِسکے لئے بہت زیادہ کوشش اور ہوشیاری درکار ہوتی ہے، ایک مضبوط رہنما چاہیے ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے خدا کے لئے شریک بنا لیا ہوتا ہے، وہ صراطِ مستقیم اور ہدایت کے سیدھے راستے سے بہت دور ہو گئے ہوتے ہیں:

فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔

بہت دور کی گمراہی سے دوچار ہو گئے ہوتے ہیں۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ

یہ لوگ خدا کے سوا جس کسی کو پکارتے ہیں، وہ بس چند عورتیں ہیں۔

وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا.[2]

اور وہ سرکش اور نیکی و فضیلت سے عاری شیطان کے سوا کسی اور کو نہیں پکارتے۔

ہم نے یہاں لفظ "مرید" کے معنی سرکش کئے ہیں، لیکن آپ اسکے معنی نیکی اور فضیلت

---

[1] سورہ نساء ٤۔ آیت ١١٦

[2] سورہ نساء ٤۔ آیت ١١٧

سے عاری بھی کر سکتے ہیں۔ یہ بھی "مرید" کے ایک معنی ہیں۔

خدا کے دھتکارے ہوئے شیطان پر خدا کی لعنت، ابتدا ہی سے اُس نے خدا کی مخالفت کا عہد کیا ہوا ہے، اور بنیادی طور پر طبیعی اور خصلتی اعتبار سے خدا اور شیطان کے درمیان صلح و آشتی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس مقام پر قرآن مجید شیطان صفت افراد اور دنیا کے شیاطین کی خصلت اور طبیعت کو بیان کرتا ہے:

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا.

شیطان نے عہد کیا ہے اور کہا ہے کہ میں بندگانِ خدا میں سے ایک خاص حصے کو اپنا طرفدار بنا لوں گا۔

یعنی کچھ بندوں کو راہِ راست سے گمراہی کی طرف کھینچ لے جاؤں گا، اُن کی عقل سلب کر لوں گا، اُن کی بصیرت زائل کر دوں گا، اُنہیں تیری ولایت کی بجائے اپنی ولایت اور فرمانروائی میں لے آؤں گا:

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ

نہیں شدت کے ساتھ دور دراز رزؤں اور تمناؤں کا اسیر کر دوں گا۔

ذرا لفظ "وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ" پر غور فرمایئے۔ اِس کلمے میں دور دراز رزوئیں اور وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو انسان کو راہِ خدا میں ہر قسم کی جدوجہد سے روک دیتی ہیں۔

دس سال مزید خوشی، راحت اور سائش کے ساتھ زندگی گزارنے کی رزو، بڑے بیٹے کو دولہا بنانے کی رزو، اپنی بچیوں کو دلہن بنا دیکھنے کی رزو، اس چھوٹے گھر اور اس چھوٹی دکان کو بڑا کرنے کی رزو، فلاں ادارے اور تنظیم کا سربراہ اور صدر بننے کی رزو، فلاں مقدار میں روپیہ کما لینے کی رزو، اپنے بیٹے کو انجینئر دیکھنے کی رزو۔ دور دراز رزوئیں اور ایسی تمنائیں جن کے بوجھ سے انسان کی گردن جھک جاتی ہے، جو انسان کے گھٹنے ٹکا دیتی ہیں، جن کے سامنے انسان بے

بس ہوجاتا ہے، اگر آپ ان رزؤں کی تڑپ اپنے دل سے نکال دیں، تو ایک عمر زادر ہیں گے، زادی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے اور اپنے آپ کو کسی قید و بند کا اسیر محسوس نہیں کریں گے۔

لہٰذا شیطان کہتا ہے:

وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ

اُنہیں دور دراز رزؤں کا اسیر کردوں گا۔

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ

اُنہیں حکم دوں گا کہ وہ جانوروں کے کان کاٹ ڈالیں۔

یہ جاہلیت کی غلط سنتوں میں سے ایک سنت کی جانب اشارہ ہے۔ البتہ ممکن ہے اِس جملے میں ایک بڑا راز اور رمز پوشیدہ ہو جس پر حقیر نے بہت زیادہ کام نہیں کیا ہے اور اِس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اُسے دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا ہے۔

ظاہراً مسئلہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی جاہلی سنت میں یہ دستور تھا کہ وہ لوگ جانور کے کان کاٹتے تھے، اُس میں سوراخ کرتے تھے، تاکہ اس ذریعے سے رزق، برکت اور سلامتی حاصل کریں۔ یہ زمانہ جاہلیت کی سنت تھی، قرآن مجید غیر الٰہی سنتوں، افکار، طریقوں اور رسموں کی علامت کے طور پر اس کا ذکر کرتا ہے۔

دیکھئے کس قدر مضحکہ خیز اور کھوکھلی بات ہے۔ بنیادی طور پر شیطانی سنتیں سب کی سب اسی طرح ہیں:

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ط

قرآن کریم شیطان کی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگ جو میرے حکم کے تابع ہیں میں اُنہیں حکم دوں گا کہ وہ الٰہی خلقت، فطرت اور سرشت میں ردوبدل کریں اور جن لوگوں کو میں تیری حکومت اور ولایت کے علاقے سے شکار کرکے اپنی ولایت کے ویرانے میں

لے آؤں گا، اُنہیں حکم دوں گا اور اُنہیں اکساؤں گا کہ وہ خلقت اور فطرتِ الٰہی کو ترک کردیں، اور جس راہِ عمل کو تو نے اُن کے لئے مقرر کیا ہے اُس سے دور ہو جائیں۔ میں اُن کے لئے خلافِ فطرت قانون بناؤں گا، اور اُن کے سامنے خلافِ فطرت راستہ رکھوں گا، ایک ایسا راستہ جو اُنہیں انسان کی فطری منزل کے سوا کسی اور منزل پر پہنچاتا ہے:

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ

میں اُنہیں حکم دوں گا کہ وہ خدا کی خلقت، فرینش اور فطرت کو بدل دیں۔

یہ خدا کے ساتھ شیطان کا عہد ہے۔ اس عہد سے خدا سے اُس کی ضد اور خدا سے اُس کی عناد ظاہر ہوتی ہے۔ تمام شیطانوں کا لائحہ عمل اور اسکیم یہی ہے۔ دنیا کے تمام شیطان یہی کرتے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ اگر لوگ خداداد فطرت اور سرشت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں، تو شیطان اُن کی راہ میں نہیں آئے گا۔ بلکہ وہ اُن لوگوں کو فطرت و سرشتِ الٰہی سے دور کرتا ہے جو اُسکی ولایت اور تسلط کو قبول کر لیتے ہیں۔ کیونکہ بغیر اسکے اس کا بس نہیں چلتا، اس کا کام آگے نہیں بڑھتا، اور اسکی شیطانیت بے کار ہو جاتی ہے۔

لہٰذا اسکے بعد خدا ہمیں اور آپ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا۔[1]

جو کوئی خدا کی بجائے شیطان کی ولایت قبول کرے گا وہ کھلے نقصان میں رہے گا۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ؕ

شیطان اُن سے وعدہ کرتا ہے اور اُنہیں دور دراز آرزوؤں اور تمناؤں میں مبتلا کرتا ہے۔

---

[1] سورہ نساء ٤۔ آیت ١١٩

وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا.[1]

اور شیطان جو بھی وعدے کرتا ہے وہ دھوکے، فریب اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔

[1] سورہ نساء ٤۔ آیت ١١٨ تا ١٢٠

ولایت اور ہجرت

ہجرت کا شمار اُن مسائل میں ہوتا ہے جو ولایت کے بارے میں ہمارے پیش کردہ وسیع مفہوم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ پچھلی تقاریر میں ہم نے عرض کیا تھا کہ ولایت کے معنی ہیں مومنین کی صف میں موجود عناصر کے مابین مضبوط اور مستحکم باہمی رابطے کا قیام، مومن اور غیر مومن صفوں کے درمیان ہر قسم کی وابستگی کا خاتمہ، اور بعد کے مراحل میں مومنین کی صف کے تمام افراد کا اُس مرکزی نقطے اور متحرک قوت یعنی ولی، حاکم اور امام سے انتہائی مضبوط اور قوی ارتباط جس کے ذمے اسلامی معاشرے کی تنظیم و تشکیل ہے۔

ہم نے اِس بارے میں بھی گفتگو کی تھی کہ کون اشخاص اسلامی معاشرے کے ولی اور حاکم ہو سکتے ہیں اور اِس کا جواب قرآن کریم سے حاصل کیا تھا، جو کہتا ہے کہ:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ۔[1]

تمہارا ولی امر صرف خدا، اُس کا رسول اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکات دیتے ہیں۔

اور اس آیت کے حوالے سے ہم نے امیر المومنین علیہ السلام کے قصّے کی جانب اشارہ کیا تھا۔

---

[1] سورہ مائدہ ۵۔ آیت ۵۵

اگر ہم ولایت کو اس وسعت کے ساتھ سمجھیں اور اسے فروعی اور دوسرے درجے کا مسئلہ قرار دے کر چھوڑ نہ دیں، تو ولایت قبول کرنے کے بعد جن چیزوں کا سامنا ہوسکتا ہے اُن میں سے ایک چیز ہجرت بھی ہے۔ کیونکہ اگر ہم نے خدا کی ولایت کو قبول کیا، اور اس بات کو مان لیا کہ انسان کی تمام جسمانی، فکری اور روحانی قوتوں اور صلاحیتوں کو ولی الٰہی کی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال ہونا چاہیئے۔

مختصر یہ کہ انسان کو اپنے وجود کے تمام عناصر کے ساتھ بندہ خدا ہونا چاہیئے، نہ کہ بندہ طاغوت، تو لامحالہ ہمیں یہ بات بھی قبول کرنی پڑے گی کہ اگر کسی جگہ ہمارا وجود، ہماری ہستی اور ہماری تمام صلاحیتیں ولایتِ الٰہی کے تابع فرمان نہ ہوں، بلکہ طاغوت اور شیطان کی ولایت کے زیرِ فرمان ہوں، تو خدا سے ہماری وابستگی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو طاغوت کی قید و بند سے زاد کرائیں اور ولایتِ الٰہی کے پُر برکت اور مبارک سائے تلے چلے جائیں۔ ظالم حاکم کی ولایت سے نکل کر امامِ عادل کی ولایت میں داخل ہوجانے کا نام ہجرت ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ہجرت ولایت سے منسلک مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ یہ وہ چوتھا نکتہ ہے جس پر ولایت کے بارے میں کی جانے والی اِن تقاریر کے سلسلے میں ہم گفتگو کریں گے۔

انفرادی ہجرت

ایک انسان کو طاغوت اور شیطان کی ولایت کے تحت نے سے کیوں بچنا چاہیئے؟

اس سوال کا جواب ایک دوسرے سوال کے جواب سے وابستہ ہے، اور ہم آپ سے چاہتے ہیں کہ آپ فوراً اپنے ذہن میں اس سوال کا اِس انداز سے تجزیہ و تحلیل کیجئے گا کہ آپ

خود اپنے پاس موجود اسلامی اور مذہبی تعلیمات اور معلومات کے مطابق اِس کا جواب دے سکیں۔ اسکے بعد اگر آپ کا جواب اُس جواب جیسا نہ ہوا جو ہمارے ذہن میں ہے اور ہمارے جواب سے مختلف ہوا، تب اس موضوع پر گفتگو کی گنجائش رہے گی۔

سوال یہ ہے کہ: کیا طاغوت کی حکومت میں رہتے ہوئے مسلمان نہیں رہا جا سکتا؟

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مسلمان شیطان کی ولایت کے تحت زندگی بسر کرے، لیکن رحمان کا بندہ ہو؟

ایسا ہوسکتا ہے یا نہیں؟

کیا یہ ممکن ہے کہ: انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور اسکی ہدایت کے تمام گوشوں پر ایک غیر الٰہی عامل کی حکمرانی ہو، انسانوں کے جسموں اور اُن کی فکروں کی تنظیم وتشکیل اور اُن کا انتظام وانصرام ایک غیر الٰہی عامل کے ہاتھ میں ہو، یہی غیر الٰہی عامل افرادِ معاشرہ کے جذبات و احساسات کو بھی کبھی اِس رُخ پر اور کبھی اُس رُخ پر دھکیل رہا ہو اور انسان اِس قسم کے طاغوتی اور شیطانی عوامل کے قبضہ قدرت میں زندگی بسر کرنے کے باوجود خدا کا بندہ اور مسلمان بھی ہو۔

کیا یہ چیز ممکن ہے، یا ممکن نہیں ہے؟

پ اِس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کیجئے اور اپنے ذہن میں اِس کا جواب تیار کیجئے، دیکھئے یہ ہوسکتا ہے یا نہیں ہوسکتا؟

اِس سوال کا جواب دینے کے لئے خود اِس سوال کا کچھ تجزیہ وتحلیل کرنا ضروری ہے، تا کہ جواب واضح ہوجائے۔

ہم نے پوچھا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان شیطان کی ولایت کے تحت ہو، اِسکے باوجود مسلمان بھی ہو؟

اِس سوال کے دو اجزا ہیں اور ہمیں چاہیۓ کہ ہم اِن دو اجزا کا درست تجزیہ وتحلیل

کریں، اور دیکھیں کہ اِن کے کیا معنی ہیں؟

پہلا جز یہ ہے کہ کوئی شخص شیطان کی ولایت کے تحت ہو۔

شیطان کی ولایت کے تحت ہونے کے کیا معنی ہیں؟

اگر ولایت کے اُن معنی کو جو ہم نے آیتِ قرآنی سے اخذ کئے ہیں، "ولایتِ شیطان" کی عبارت کے پہلو میں رکھیں، تو معلوم ہوجائے گا کہ ولایتِ شیطان سے کیا مراد ہے۔

ولایتِ شیطان سے مراد یہ ہے کہ شیطان (شیطان کے اُنہی مجموعی معنی کے مطابق جنہیں ہم نے بارہا بیان کیا ہے) انسان کے وجود میں پائی جانے والی تمام توانائیوں، صلاحیتوں، تخلیقی قوتوں اور اعمال پر مسلط ہو اور انسان جو کچھ انجام دے وہ شیطان کے معین کردہ دستور کے مطابق ہو، انسان جو کچھ سوچے وہ اِس سمت میں ہو جس کا تعین شیطان نے کیا ہے، اُس انسان کی طرح جو کوہساروں سے نیچے بہنے والے سیلاب کی لپیٹ میں ہو۔ اس انسان کو یہ بات پسند نہیں ہوتی کہ وہ سخت اور کھردری چٹانوں سے ٹکرائے اور اُس کا سر پاش پاش ہوجائے، اُسے یہ بات پسند نہیں ہوتی کہ وہ اس پانی میں بہتے ہوئے گہرے گڑھے میں جا پڑے، اُسے یہ بات پسند نہیں ہوتی کہ پانی کی ان موجوں کے درمیان اُس کا دم گھٹ کے رہ جائے۔ باوجود یہ کہ اُسے پسند نہیں ہوتا لیکن پانی کا یہ تیز وتند ریلا بغیر اُسکی مرضی کے اُسے بہائے لئے جاتا ہے، وہ ہاتھ پاؤں بھی مارتا ہے، وہ کبھی اِس طرف اور کبھی اُس طرف سہارا بھی لیتا ہے، راستے میں نے والے پودوں اور درختوں کو پکڑنے کی کوشش بھی کرتا ہے، لیکن پانی کا تیز بہاؤ اُسے بے اختیار بہائے لئے جاتا ہے۔

ولایتِ طاغوت اور ولایتِ شیطان اسی قسم کی چیز ہے۔

لہٰذا آیتِ قرآن کہتی ہے:

وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً يَّدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ ۚ [۱]

"ایسے رہنما اور قائدین بھی ہیں جو اپنے پیروکاروں اور زیرِ فرمان افراد کو دوزخ کی آگ اور بدبختی کی طرف کھینچے لئے جاتے ہیں۔"

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت فرماتی ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ كُفۡرًا وَّاَحَلُّوۡا قَوۡمَهُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ ۝۲۸ جَهَنَّمَ ۚ يَصۡلَوۡنَهَا ؕ وَبِئۡسَ الۡقَرَارُ ۝۲۹ [۲]

کیا تم نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمت کو کفرانِ نعمت سے تبدیل کر دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے سپرد کر دیا اور دوزخ جو بدترین ٹھکانہ ہے، اس میں جا پڑے۔

کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمت کا کفران کیا؟

وہ نعمت جس کا اُن لوگوں نے کفران کیا، کیا تھی؟

نعمتِ قدرت، جو پروردگار کی قدرت کا مظہر ہے، دنیوی طاقتیں، انسان کے معاملات کے نظم ونسق کی نعمت، انسانوں کی بکثرت صلاحیتوں، افکار اور قوتوں کو ہاتھ میں رکھنے کی نعمت، یہ سب کی سب چیزیں نعمت ہیں اور ایسے سرمائے ہیں جو انسان کے لئے خیر کا سرچشمہ ہو سکتے ہیں۔

اِس آیت میں جن افراد کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اُن کی فرمانروائی میں زندگی گزارنے والا ہر انسان ایک عظیم اور بزرگ انسان بن سکتا تھا، اور کمال کے بلندترین درجات تک رسائی پا سکتا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے نعمات کا کفران کیا اور جس مقصد کے لئے اُن سے استفادہ کرنا چاہیے تھا اُس مقصد کے لئے اُنہیں استعمال نہیں کیا۔

---

[۱] سورہ قصص ۲۸۔ آیت ۴۱

[۲] سورہ ابراہیم ۱۴۔ آیت ۲۸، ۲۹

اسکے بعد فرماتا ہے:

وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ

اور وہ خود جانتے بوجھتے، اپنی قوم اور اپنے زیرِ فرمان لوگوں کو نیستی و نابودی اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے گئے۔

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ.

اُنہیں جہنم کی طرف لے گئے، جس میں الٹے منہ پھینکے جائیں گے اور یہ کیسی بُری جگہ اور ٹھکانہ ہے۔

یہ آیت امام موسیٰ ابن جعفر علیہما السلام نے ہارون کے سامنے پڑھی اور ہارون کو یہ بات باور کرائی کہ تو وہی شخص ہے جو اپنی قوم کو اور اپنے آپ کو بدترین منزل اور مہلک ترین ٹھکانے سے ہمکنار کرے گا۔

ہارون نے (امام سے) سوال کیا تھا کہ کیا ہم کافر ہیں؟ اُسکی مراد یہ تھی کہ کیا ہم خدا، پیغمبر اور دین پر عقیدہ نہیں رکھتے ہیں۔

لہٰذا امام علیہ السلام نے اُسکے جواب میں اِس آیت کی تلاوت فرمائی، تا کہ اسے یہ بات ذہن نشین کرا دیں کہ کافر فقط وہی شخص نہیں ہوتا جو صاف اور صریح الفاظ میں خدا کا انکار کرے، یا قرآن کو جھٹلائے، یا پیغمبر کو مثلاً افسانہ کہے۔ ٹھیک ہے کہ اِس قسم کا شخص کافر ہے اور کافر کی بہترین قسم سے ہے جو صریحاً اپنی بات کہتا ہے اور انسان اسے پہچانتا ہے اور اسکے بارے میں اپنے موقف کا اچھی طرح تعین کرتا ہے۔

کافر سے بدتر شخص وہ ہے جو ان عظیم نعمتوں کا کفران کرے جو اسے میسّر ہیں اور اُنہیں غلط راستے میں استعمال کرے۔ ایسا شخص نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے ماتحت تمام انسانوں کو جہنم میں جھونک دیتا ہے۔

طاغوت کی ولایت ایسی ہی چیز ہے۔ وہ شخص جو طاغوت کی ولایت میں زندگی بسر کرتا ہے، اُسے گویا اپنے اوپر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل ہی بے اختیار ہوتا ہے۔ بعد میں جب ہم یہ قرآن کے معنی بیان کریں گے، تو اس نکتے کی تفسیر واضح ہوجائے گی۔ البتہ وہ شخص سیلابی ریلے کی زد پر ہوتا ہے اوراُس میں بہا چلا جاتا ہے۔ وہ ہاتھ پاؤں مارنا چاہتا ہے، لیکن نہیں مار پاتا، وہ دیکھتا ہے کہ تمام لوگ جہنم کی طرف جارہے ہیں اور اُسے بھی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ لہٰذا وہ جہنم کے راستے سے پلٹنا چاہتا ہے۔ }لیکن بے بس ہوتا ہے{

کیا آپ کبھی کسی مجمع میں پھنسے ہیں؟ اِس موقع پر آپ کا دل چاہتا ہے کہ ایک طرف ہوجائیں، لیکن مجمع آپ کو ایک تنکے کی طرح اٹھا کر دوسری طرف پھینک دیتا ہے۔

ایسا شخص جو طاغوت کے زیرِ ولایت ہو،

وہ چاہتا ہے کہ نیک بن جائے، صالح زندگی بسر کرے، ایک انسان کی طرح زندگی گزارے، مسلمان رہے اور مسلمان مرے،

لیکن ایسا نہیں کرسکتا۔

یعنی معاشرے کا ریلا اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لئے جاتا ہے، اور اِس طرح لئے جاتا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں مارسکتا۔ وہ اگر ہاتھ پاؤں مارتا بھی ہے، توسوائے اپنی قوت کے زیاں کے اسے کچھ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف ہاتھ پاؤں نہیں مار پاتا، بلکہ اِس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنی حالت کو بھی نہیں سمجھ پاتا۔

مجھے نہیں معلوم آپ نے سمندر سے شکار ہوتی مچھلیوں کو دیکھا ہے یا نہیں۔ کبھی کبھی ایک جال میں ہزاروں مچھلیاں پھنس جاتی ہیں، جنہیں سمندر کے وسط سے ساحل کی طرف کھینچ کر لاتے ہیں، لیکن اُن میں سے کوئی مچھلی یہ نہیں جانتی کہ اُسے کہیں لے جایا جارہا ہے، ہر ایک یہ

تصور کرتی ہے کہ وہ خود اپنے اختیار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔لیکن درحقیقت وہ بے اختیار ہوتی ہے، اُسکی منزل وہی ہوتی ہے جس کی جانب جال کا مالک وہ شکاری اسے لے جا رہا ہوتا ہے۔

جاہلی نظام کا غیر مرئی جال انسان کو اس سمت کھینچتا ہے جس سمت اس جال کی رہنمائی کرنے والے چاہتے ہیں۔اس نظام میں زندگی گزارنے والا انسان بالکل نہیں سمجھ پاتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔کبھی کبھی تو وہ اپنی دانست میں یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ سعادت اور کامیابی کی منزل کی طرف گامزن ہے، جبکہ اُسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جہنم کی طرف جا رہا ہے:

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔

یہ ولایتِ طاغوت اور ولایتِ شیطان ہے۔

یہ پہلی عبارت اُن دو عبارتوں میں سے ایک تھی جن سے مل کر (مذکورہ بالا) سوال بنا تھا اور سوال یہ تھا کہ کیا طاغوت اور شیطان کی ولایت اور حکومت میں رہتے ہوئے مسلمان نہیں رہا جا سکتا؟

اجمالاً ہم نے طاغوت کی ولایت اور حکومت میں زندگی گزارنے کو سمجھ لیا ہے۔یعنی یہ جان لیا ہے کہ اِس سے کیا مراد ہے۔اگر ہم اِسکی تفسیر کرنا چاہیں، تو ایک مرتبہ پھر تاریخ کی طرف پلٹ سکتے ہیں۔

آپ دیکھئے بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانے میں عالمِ اسلام کس جوش و خروش سے محوِ سفر تھا۔دیکھئے اُس دور کے اسلامی معاشرے میں علم و دانش کی کیسی عظیم لہر اُٹھی تھی، کیسے کیسے عظیم اطبّا پیدا ہوئے تھے، زبان دانی اور عمومی علمی افلاس کے اُس دور میں عالمِ اسلام میں کیسے عظیم مترجمین پیدا ہوئے تھے، جنھوں نے قدیم تہذیبوں کے عظیم ثار کو عربی زبان میں ترجمہ کیا اور اُن کی نشر و اشاعت کی۔مسلمان تاریخ، حدیث، علومِ طبیعی، طب اور نجوم کے شعبوں، حتیٰ فنونِ لطیفہ

میں بھی انتہائی ممتاز مقام کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ آج بھی جب فرانس سے تعلق رکھنے والے گستاف لوبون کی مانند ایک شخص، یا کوئی اور مصنف اور مستشرق ان ظاہری باتوں کو دیکھتا ہے، تو اسلام کی دوسری، تیسری اور چوتھی صدیوں کو اسلام کے عروج کی صدیاں قرار دیتا ہے۔

گستاف لو بون نے "چوتھی صدی ہجری میں تاریخِ تمدنِ اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ ایک ایسا تمدن جسے وہ ایک عظیم تمدن سمجھتا ہے اور چوتھی صدی ہجری کو اس عظیم تمدن کی صدی بیان کرتا ہے۔ مجموعی طور پر جب کوئی یورپی مستشرق دوسری، تیسری اور چوتھی صدی ہجری پر نگاہ ڈالتا ہے، تو وہ دنگ رہ جاتا ہے۔ اِسکی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت کے اسلامی معاشرے میں حیرت انگیز گرمیاں، صلاحیتیں اور لیاقتیں ظاہر ہوئی تھیں۔

لیکن ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ یہ تمام سرگرمیاں اور صلاحیتیں، جو اس دور میں ظاہر ہوئیں، کیا ان کا نتیجہ اسلامی معاشرے اور انسانیت کے مفاد میں برمد ہوا؟

آج اُس زمانے کو دس صدیاں گزر چکی ہیں، اور ہم اس زمانے کے بارے میں کسی تعصب کا شکار نہیں ہیں اور غیر مسلم دنیا کے بالمقابل ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ عالمِ اسلام تھا جس نے جامعات کی بنیاد رکھی، یہ عالمِ اسلام تھا جس نے فلسفے کی تشکیل کی، یہ عالمِ اسلام تھا جس نے طبابت اور طبیعیت کے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ لیکن کیا خود اپنے حلقوں میں ہم حق و انصاف کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن تمام قوتوں اور صلاحیتوں کا نتیجہ ٹھیک، برمحل اور انسانیت اور اسلامی معاشرے کے مفاد میں برمد ہوا؟

آج دس صدیاں گزرنے کے بعد اسلامی معاشرے کے پاس اُس میراث میں سے کیا باقی ہے؟ اور کیوں باقی نہیں ہے؟

آخر وہ علمی اور تہذیبی دولت ہمارے لئے کیوں باقی نہ بچ سکی؟

ہم دس صدی پہلے کے اُس تابناک معاشرے کی طرح آج کیوں دنیا میں درخشاں اورجلوہ نمانہیں؟ کیا اسکی وجہ اسکے سوا کچھ اور ہے کہ وہ تمام سرگرمیاں اورجلوہ نمائیاں طاغوت کی حکمرانی میں رہتے ہوئے تھیں۔

من ن نگین سلیمان بہ ہیچ نستانم

کہ گاہ گاہ بر اودست اھرمن باشد

ان گمراہ کن قیادتوں نے اسلامی معاشرے کے ساتھ کھیل کھیلا، اوراپنا نام اونچا کرنے اور یہ کہلوانے کے لئے کہ مثلاً فلاں عباسی خلیفہ کے دورِاقتدار میں فلاں کام ہوا، مختلف کام کئے۔

اگر یہ حکم اں طبیعیت، ریاضی، نجوم، ادب اور فقہ کے میدانوں میں علمی ترقی کی بجائے، فقط اتنی اجازت دیتے کہ علوی حکومت برسرِ اقتدار جائے، امام جعفر صادق علیہ السلام کی حکومت قائم ہوجائے، اسلامی معاشرے کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہاتھ میں جائیں، پورے اسلامی معاشرے کی سرگرمیوں کا تعین امام جعفر صادق علیہ السلام کریں۔

اس صورت میں اگر مسلمان علمی اورادبی لحاظ سے، ان باتوں کے اعتبار سے جن پر آج دنیائے اسلام فخر وناز کرتی ہے سوسال پیچھے بھی رہتے، تب بھی یہ انسانیت کے فائدے میں ہوتا۔ انسانیت ترقی کرتی، اسلام پھلتا پھولتا، اسلامی معاشرے کی صلاحیتیں اور قوتیں صحیح راہ میں استعمال ہوتیں۔ پھر یہ صورت نہ رہتی کہ کتابیں تو ترجمہ کرتے، طب اور سائنس کے میدانوں میں ترقی کو بامِ عروج پر پہنچادیتے، لیکن انفرادی اور اجتماعی اخلاق کے اعتبار سے اس قدر کمزور ہوتے، کہ اُس دور میں پایا جانے والا طبقاتی فرق آج بھی تاریخ میں بطور یادگار محفوظ ہے۔

بالکل آج کی دنیا کے غلیظ اور ذلت میز تمدن کی طرح، کہ آج کی بڑی حکومتیں عقلوں کو دنگ کردینے والی اپنی ایجادات پر تو فخر کرتی ہیں، مثلاً کہتی ہیں کہ ہم نے فلاں دوا ایجاد کی ہے، فلاں کام کیا ہے، علمی لحاظ سے فلاں شعبے میں ترقی کی ہے، لیکن یہ حکومتیں انسانی اقدار اور اخلاق

اعتبار سے اب بھی ہزار ہا سال پرانی تاریخ جیسے حالات میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔آج بھی بے پناہ مال و دولت، بے انتہا فقر و افلاس کے پہلو بہ پہلو موجود ہے۔آج بھی غریب ممالک کے لاکھوں، کروڑوں بھوکے انسانوں کے مقابل صرف ایک فی صد انسان دولت کی فراوانی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔اسکے باوجود یہ حکومتیں اپنی سائنسی ترقی پر نازاں ہیں۔

دوسری، تیسری اور چوتھی صدی ہجری کا عظیم اسلامی تمدن اسی صورتحال سے دوچار تھا۔ اُس دور میں بہت زیادہ علمی ترقی ہوئی، لیکن امیر طبقے کا راج تھا، عیش وعشرت کا چلن تھا اور اسکے مقابل انسانیت اور انسانی فضیلتوں سے بے خبری اور طبقاتی اونچ نیچ انتہائی درجے پر موجود تھی۔ اُس زمانے میں بھی ایک طرف لوگ بھوک سے مرتے دکھائی دیتے تھے، تو دوسری طرف بسیار خوری بہت سے لوگوں کی موت کا سبب بنتی تھی۔

آخر کیا وجہ تھی کہ اُس دور کا اسلامی معاشرہ اپنی علمی سرگرمیوں اور نشاط کے باوجود انسانی فضائل وکمالات کا گلستاں نہیں بن سکا؟

دوسری اور تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھنے والی جن شخصیتوں کا تذکرہ فخر وناز کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، اور جن کا نام ہم دنیا میں قابلِ افتخار ہستیوں کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں، وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس متمدن نظام کے خلاف شدت سے جنگ کی۔مثال کے طور پر معلیٰ بن خنیس کا نام لیا جاسکتا ہے، جنہیں بیچ بازار میں سولی پر لٹکایا گیا۔یحییٰ ابن امِ طویل کا نام لیا جاسکتا ہے، جن کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے گئے، جن کی زبان کھینچ لی گئی۔محمد ابن ابی عمیر کا نام لیا جاسکتا ہے، جنہیں چارسو تازیانے مارے گئے۔یحییٰ ابن زید کا نام لیا جاسکتا ہے، جنہیں صرف اٹھارہ برس کے سن میں خراسان کی پہاڑیوں میں شہید کیا گیا۔زید بن علی کا نام لیا جاسکتا ہے، جن کے جسد کو چار سال سولی پر لٹکائے رکھا گیا۔

یہ وہ ہستیاں ہیں جن کے ناموں کو ہم آج دنیائے انسانیت کے قابلِ فخر افراد کی

فہرست میں جگہ دے سکتے ہیں۔ اِن حضرات کا اُس پرشکوہ تمدن سے کوئی تعلق نہ تھا جس کا ذکر گستاف لوبون نے کیا ہے، بلکہ یہ اُس تمدن کے مخالفین میں سے تھے۔

پس دیکھئے کہ جن معاشروں اور جن انسانوں پر طاغوت اور شیطان کی حکمرانی ہوتی ہے اور جن کے معاملات کی باگ ڈور طاغوتی اور شیطانی ہاتھوں میں ہوتی ہے، اُن معاشروں میں زندگی بسر کرنے والے افراد کی قوتیں استعمال ہوتی ہیں، اُن کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں، لیکن بالکل اُسی طرح جیسے آج کی متمدن دنیا میں کام آتی ہیں، اُسی طرح جیسے اب سے دس گیارہ سو سال پہلے عالمِ اسلام میں کام میں آتی تھیں۔ یہ ساری ترقیاں اُسی طرح بے قیمت ہیں جیسے اعلیٰ اقدار اور انسانی فضیلتوں کی نظر میں چوری سے کمایا ہوا مال بے حیثیت ہوتا ہے۔ یہ ہوتی ہے طاغوت کی ولایت اور حکومت۔

ان خصوصیت کے ساتھ کیا طاغوت کی حکومت کے تحت ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کی جاسکتی ہے؟

ذرا دیکھتے ہیں کہ دراصل مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے معنی کیا ہیں؟

مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے معنی ہیں انسان کے تمام وسائل، قوتوں اور صلاحیتوں کا مکمل طور پر خدا کے اختیار میں ہونا، اُسکے مال و دولت اور اُسکی تمام چیزوں کا خدا کے اختیار میں ہونا، اُسکی جان کا خدا کے اختیار میں ہونا، اُسکی فکر اور سوچ کا خدا کے اختیار میں ہونا۔

اِس حوالے سے بھی ہمارے پاس معاشرے اور مدنیت کی صورت میں موجود اجتماعات اور طاغوتی نظاموں سے سرکشی اختیار کر کے باہر نکلنے والے اور خدا کی طرف ہجرت کرنے والے گروہوں کی مثالیں موجود ہیں۔

پہلی مثال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مدینہ کے معاشرے کی ہے۔ مدینہ ایک

"بندہ خدا" معاشرہ تھا، ایک مسلمان معاشرہ تھا، وہاں جو قدم بھی اُٹھتا راہِ خدا میں اٹھتا۔ وہاں اگر یہودی اور عیسائی بھی اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے تھے، تو اُن کی زندگی بھی اسلامی زندگی تھی۔ اسلامی معاشرے میں عیسائی اور یہودی اہل ذمہ افراد بھی اسلام کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں اعمال کے لحاظ سے ایک شخص یہودی ہوتا ہے، لیکن معاشرے کے ایک رکن کے لحاظ سے اُس مسلمان سے کہیں زیادہ مسلمان ہوتا ہے جو ایک جاہلی نظام کے تحت زندگی بسر کرتا ہے۔

زمانہ پیغمبرؐ میں مال و دولت، نیزہ وتلوار، فکر اور سوچ، تمام انسانی اعمال، حتیٰ جذبات واحساسات بھی راہِ خدا میں ہوتے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں بھی کم وبیش یہی صورت تھی۔ اِس لئے کہ امیر المومنین علیہ السلام حاکمِ الٰہی اور ولی خدا ہونے کے ناطے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف نہ تھے۔ لیکن وہ ایک بُرے معاشرے کے وارث تھے، اُن پیچیدگیوں اور مسائل کے وارث تھے، اور اگر امیر المومنین علیہ السلام کی جگہ خود پیغمبر اسلامؐ بھی ہوتے اور پچیس سال بعد ایک مرتبہ پھر مسندِ حکومت پر جلوہ افروز ہوتے، تو یقیناً انہی مشکلات کا سامنا کرتے جو امیر المومنین علیہ السلام کو درپیش تھیں۔

گروہی ہجرت

گروہی صورت میں ہجرت کی تاریخی مثال، ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ماننے والے شیعوں کی ہجرت ہے۔ افسوس کہ ماہِ رمضان ختم ہوگیا اور ہم تفصیل کے ساتھ امامت کی بحث تک نہیں پہنچ سکے، وگرنہ ولایت کے بعد امامت کی گفتگو کرتے اور آپ کو بتاتے کہ ائمہ علیہ السلام کے زمانے میں شیعہ کس قسم کا گروہ تھے، اور یہ بات واضح کرتے کہ شیعوں کے ساتھ امام علیہ السلام کے

روابط وتعلقات اور پھر شیعوں کے اپنے معاشرے کے ساتھ روابط وتعلقات کی نوعیت کیا ہوا کرتی تھی۔لیکن اب ہم مجبور ہیں کہ اسے اجمالی طور پر عرض کریں۔

شیعہ بظاہر طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرتے تھے،لیکن باطن میں طاغوتی نظام کے یکسر برخلاف گامزن ہوتے تھے۔اس سلسلے میں بطورِ مثال اُس گروہ کا نام لیا جاسکتا ہے جو حسین ابن علی علیہ السلام کے ہمراہ تھا۔ان لوگوں نے اس سیلاب کا مقابلہ کیا اور اس سیلابی ریلے کی مخالف سمت چلے جو انہیں اپنے ہمراہ بہا کر لیجانا چاہتا تھا۔یہ تاریخ میں گروہی ہجرت اور انقلاب کی مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔لیکن عام افراد،اور کلی طور پر عرض کریں کہ ایک فرد کسی طاغوتی معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہوئے مسلمان باقی نہیں رہ سکتا اور اُس کا وجود،اُس کے وسائل، اُسکی قوتیں اور اُسکی تمام تر صلاحیتیں احکامِ الٰہی کے تابع نہیں رہ سکتیں۔ایسا ہونا محال ہے۔

اگر ایک مسلمان طاغوتی ماحول اور طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرے،تو بہر حال اسکی اسلامیات کا ایک حصہ طاغوت کی راہ پر ہوگا،وہ خدا کا سو فیصد بندہ نہیں ہوسکتا۔

اصولِ کافی جو شیعوں کی معتبر ترین اور قدیم ترین کتابوں میں سے ہے،اُس میں اِس درجِ ذیل حدیث کو کئی طریقوں سے نقل کیا گیا ہے،آپ کتاب الحجہ کے باب "اس شخص کے بارے میں جس نے منصوص من اللہ امام کے بغیر خدا کی عبادت کی" میں مطالعہ کیجئے،اس روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحِیِی اَنۡ یُعَذِّبَ اُمّه دانَتۡ بِاِمَامٍ لَیۡسَ مِنَ اللّٰهِ وَاِنۡ کَانَتۡ فِی اَعۡمَالِهَا بَرَّةً تَقِیَّةً وَاِنَّ اللّٰهَ لَیَسۡتَحۡیِی اَنۡ یُعَذِّبَ اُمَّةً دانَتۡ بِاِمَامٍ مِنَ اللّٰهِ وَاِنۡ کَانَتۡ فی اَعۡمَالِهَا ظَالِمَةً مَسِیئَةً۔" [1]

خدا ایسی امت کو عذاب دینے میں شرم محسوس نہیں کرتا جو ایسے امام کی تابع ہو جو

---

[1] اصول کافی۔ج ۲۔ص ۲۰۶

خدا کی طرف سے نہیں، اگر چہ وہ اپنے اعمال میں نیکوکار اور پرہیز گار ہو۔ بے شک
خدا ایسی امت کو عذاب دینے میں شرم محسوس کرتا ہے جو خدا کی جانب سے مقرر کردہ
امام کی تابع ہو، اگر چہ اپنے اعمال کے حوالے سے ظالم اور بدکردار ہو۔

عجیب حدیث ہے، یہ حدیث کہتی ہے کہ وہ لوگ جو خدا کے ولی کی حکومت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں، اہل نجات ہیں، اگر چہ وہ اپنے انفرادی اور نجی افعال میں کبھی کبھار گناہوں میں بھی مبتلا ہو جاتے ہوں اور وہ لوگ جو شیطان اور طاغوت کی حکومت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں وہ بدبخت اور عذاب کا شکار ہونے والے لوگ ہیں، اگر چہ وہ اپنے انفرادی اور شخصی کاموں میں نیکوکار اور عملِ صالح انجام دینے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ انتہائی عجیب بات ہے۔ اگر چہ حدیث کو کئی طریقوں سے بیان کیا گیا ہے، لیکن سب یہی ایک معنی دیتے ہیں۔

ہم ہمیشہ اس حدیث کے مفہوم کی وضاحت میں ایک ایسی گاڑی کی مثال پیش کرتے ہیں جس میں آپ مثلاً نیشاپور جانے کے لئے سوار ہوں۔ اگر یہ گاڑی نیشاپور کی طرف چلے گی، تو آپ لازماً اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے اور اگر مثلاً طبس یا قوچان کی طرف جائے گی، تو لازماً آپ اپنی منزل (نیشاپور) نہیں پہنچ سکیں گے۔

اب اگر نیشاپور جانے والی گاڑی میں سوار مسافر ایک دوسرے کے ساتھ انسانی داب کے ساتھ میل جول رکھیں گے، تو کیا خوب، اور اگر انسانی داب اور نیکی و احسان کے ساتھ باہم میل جول نہیں رکھیں گے، تب بھی خرکار نیشاپور تو پہنچ ہی جائیں گے۔ وہ اپنی منزل پر جا پہنچیں گے، چاہے انہوں نے راستے میں کچھ بُرے کام بھی کئے ہوں۔ ان برے کاموں کے بھی ثار و نتائج ظاہر ہوں گے، جنہیں برداشت کرنے پر وہ مجبور ہوں گے۔ لیکن منزل پر بہرحال پہنچ جائیں گے۔ اس کے برخلاف وہ گاڑی جسے آپ کو نیشاپور لے جانا چاہیۓ، وہ آپ کو نیشاپور کے بالکل برعکس سمت لے جائے۔ اگر اس گاڑی کے تمام افراد مودب ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ

انتہائی احترام آمیز سلوک کریں، ایک دوسرے کے ساتھ خنداں پیشانی سے میل جول رکھیں اور یہ دیکھیں کہ یہ گاڑی نیشاپور کی بجائے قوچان کی طرف جارہی ہے، لیکن یہ دیکھنے کے باوجود کسی ردِعمل کا اظہار نہ کریں، تو ٹھیک ہے کہ یہ لوگ بہت اچھے انسان ہیں، ایک دوسرے کے لئے انتہائی مہربان ہیں، لیکن کیا اپنے مقصد اور منزل پر پہنچ سکیں گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔

پہلی مثال میں گاڑی کا ڈرائیور ایک امین شخص تھا، ایک محترم ومکرم انسان تھا: امام من اللہ تھا، جس نے اُنہیں منزلِ مقصود پر پہنچا دیا، اگرچہ وہ لوگ بداخلاق تھے:

وَاِنْ كَانَتْ فِى اَعْمَالِهَا ظَالِمَةً مَسِيئَةً۔

جبکہ دوسری مثال میں گاڑی کا ڈرائیور راستے ہی سے واقف نہ تھا، امین نہیں تھا، خواہشِ نفس کا پجاری تھا، مست تھا، راہ سے بھٹکا ہوا تھا، اُسے قوچان میں کوئی کام تھا اور اُس نے اپنے کام کو لوگوں کی خواہش پر مقدم رکھا۔ اس گاڑی میں سوار لوگ کسی صورت اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ اگرچہ یہ لوگ گاڑی کے اندر باہم انتہائی مہربان اور خوش اخلاق ہوں:

وَاِنْ كَانَتْ فِى اَعْمَالِهَا بَرَّةً تَقِيَّةً۔

لیکن آخرکار عذابِ خدا کا سامنا کریں گے، اپنی منزل نہیں پاسکیں گے۔

لہٰذا، ایک ایسا معاشرہ جس کا انتظام وانصرام طاغوت کے ہاتھ میں ہو، وہ اُس گاڑی کی مانند ہے جسے ایک غیر امین ڈرائیور چلا رہا ہو، اُس معاشرے میں زندگی بسر کرنے والے انسان اپنے مقصد اور اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے اور مسلمان نہیں رہ سکیں گے۔

اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ اِن حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟

اِس سوال کا جواب قرآن کریم کی آیت دیتی ہے، اور کہتی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ

اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا۔[1]

وہ لوگ جو اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں، جب فرشتے اُن کی روح قبض کرتے ہیں، تو اُن سے پوچھتے ہیں: تم کس حال میں مبتلا تھے؟ وہ کہتے ہیں: ہم زمین میں لاچار بنا دیئے گئے تھے۔ فرشتے کہتے ہیں: کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ پس اللہِ ن لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین منزل ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے: وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ پر، اپنے مستقبل پر اور اپنی ہر چیز پر ظلم کیا ہے، جب اُن کی موت قریب آتی ہے، تو اُن کی روح قبض کرنے پر مامور خدا کے فرشتے اُن سے پوچھتے ہیں!

فِيْمَ كُنْتُمْ۔

تم کس حال میں تھے؟ کہاں تھے؟

جب سمانی فرشتہ یہ دیکھتا ہے کہ اس انسان کی حالت اسقدر خراب ہے، جب وہ اُس طبیب یا اُس جراح کی مانند جو ایک بیمار کے معالجے کے لئے تا ہے، یہ دیکھتا ہے کہ بیمار کی حالت بہت خراب، افسوس ناک اور مایوس کن ہے، تو کہتا ہے: تم کہاں پڑے ہوئے ہو؟ تمہاری یہ حالت کیسے ہوگئی؟

ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ملائکہ اس بیچارے کی بری حالت پر، اسکی روح کی خستگی پر، اس بدبختی اور عذاب پر جو اس کا منتظر ہے، تعجب کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں: تم نے کہاں زندگی بسر کی ہے؟ تم کہاں تھے جو تم نے اپنے آپ پر اس قدر ظلم کیا اور اب اپنے نفس پر ظلم کرتے

---

[1] سورہ نساء ٤ ۔ آیت ٩٧

ہوئے دنیا سے رخصت ہورہے ہو؟

وہ جواب میں کہتے ہیں:

"قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ۔"

ہم زمین پر جن لوگوں کے درمیان زندگی بسر کررہے تھے، ان میں لاچار تھے،

ہم بے اختیار عوام میں سے تھے۔

مستضعفین معاشرے کا وہ گروہ ہوتے ہیں جن کے اختیار میں معاشرہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ مجبور ولاچار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ معاشرے کی پالیسیوں، اسکی راہ وروش، اسکی سمت وجہت، اسکی حرکت، اسکے سکون اور اسکی سرگرمیوں کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا، یہ لوگ اُس سمت چل پڑتے ہیں جہاں اُن کی رسی کھینچنے والا چاہتا ہے، منہ اُٹھائے اسکے پیچھے چلے جاتے ہیں، انہیں کہیں جانے اور کچھ کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

نرسری کلاس کے چند بچوں کو فرض کیجیے۔ اُن بچوں کو نہیں جن کی عمر سات برس ہو چکی ہے، کیونکہ آج کل سات برس کے بچوں کی آنکھیں اور کان بھی ان باتوں سے بہت اچھی طرح شنا ہیں۔ چار پانچ سال کے بچوں کو پیشِ نظر رکھیے، جنہیں گزشتہ زمانے کے مکتب خانوں کی مانند آج نرسری اسکولوں میں بٹھا دیتے ہیں۔ ہمیں وہ مکتب یاد آتا ہے جس سے ہم چھٹی کے وقت اکٹھے باہر نکلتے تھے۔ اصلاً ہمیں سمجھ نہیں ہوتی تھی کہ ہم کہاں جارہے ہیں، بچوں کو بھی پتا نہیں ہوتا تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ ایک مانیٹر، یا ایک ذرا بڑا لڑکا ہماری رہنمائی کرتا تھا کہ اِس طرف جاؤ، اُس طرف نہ جاؤ۔ ہمیں بالکل خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ ہم کہاں چلے جارہے ہیں، اچانک پتا چلتا تھا کہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہیں یا اپنے دوست کے گھر کے دروازے پر موجود ہیں۔ اب اگر کبھی اُس مانیٹر کا دل چاہتا کہ ہمیں گلی کوچوں میں پھرائے، تو یکبارگی ہم دیکھتے کہ مثلاً ہم

فلاں جگہ ہیں۔

زمین پر مستضعف لوگ وہ ہیں جنہیں ایک معاشرے میں رہنے کے باوجود اس معاشرے کے حالات کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔نہیں جانتے کونسی چیز کہاں ہے۔نہیں جانتے کہ کہاں چلے جارہے ہیں اور یہاں سے چل کر کہاں پہنچیں گے،اور کون انہیں لئے جا رہا ہے،اور کس طرح یہ ممکن ہے کہ وہ اسکے ساتھ نہ جائیں،اور اگر نہ جائیں تو انہیں کیا کام کرنا چاہیئے۔

انہیں بالکل پتا نہیں ہوتا، بالکل بھی متوجہ نہیں ہوتے،اور بالکل کولھو کے بیل کی طرح جس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، جو مسلسل چل رہا ہوتا، جو اسی طرح چلتا رہتا ہے اور گھومتا رہتا ہے۔ اگر یہ حیوان کچھ سمجھ پاتا تو خود سے تصور کرتا اور کہتا کہ اِس وقت مجھے پیرس میں ہونا چاہیئے۔لیکن جب غروبِ آفتاب کے قریب اُسکی آنکھیں کھولتے ہیں،تو وہ دیکھتا ہے کہ وہ تو وہیں کھڑا ہے جہاں صبح کھڑا تھا۔اسے بالکل پتا نہیں ہوتا کہ کہاں چلا ہے،نہیں جانتا کہ کہاں جارہا ہے۔

البتہ یہ بات اُن معاشروں سے متعلق ہے جو صحیح نظام پر نہیں چلائے جاتے،اور انسان کی کسی حیثیت اور قدر و قیمت کے قائل نہیں ہوتے،اُن معاشروں سے متعلق نہیں جو انسان اور انسان کی رائے کی عزت اور احترام کے قائل ہیں،اُس معاشرے سے تعلق نہیں رکھتی جس کے قائد پیغمبرؐ ہیں،جن سے قرآن کریم کہتا ہے کہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۔ [1]

اور معاملات وامور میں ان سے مشورہ کرو۔

باوجود یہ کہ آپ خدا کے رسول ہیں،باوجود یہ کہ آپ کو لوگوں سے مشورے کی ضرورت نہیں، پھر بھی آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ لوگوں سے مشورت کریں اور اُنہیں عزت واحترام دیں، اُنہیں حیثیت دیں۔ایسے معاشروں کے عوام لاعلم اور بے شعور نہیں ہوتے۔

---

[1] سورہ آلِ عمران ۳۔آیت ۱۵۹

تاہم وہ معاشرے جو مرانہ، ظالمانہ، یا جاہلانہ نظام پر چلائے جاتے ہیں، وہاں کے اکثر لوگ مستضعف ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ

ہم زمین پر مستضعفین میں سے تھے۔

اُنہوں نے ہمیں اسی طرح کھینچا، اُٹھایا اور پٹخ دیا، ہمیں قدموں تلے پامال کیا، بے برو کیا۔ لیکن ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ وہ یہ عذر پیش کرتے اور یہ جواب دیتے ہیں۔

ان کے جواب میں ملائکہ کہتے ہیں:

"اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا۔"

کیا پروردگار کی زمین یہیں تک محدود تھی؟

کیا پوری دنیا صرف اسی معاشرے تک محدود تھی جس میں تم مستضعف بنے زندگی بسر کر رہے تھے؟

کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی، کہ تم اس قید خانے سے نکل کر ایک زاد خطہ ارضی میں چلے جاتے، جہاں تم خدا کی عبادت کر سکتے، ایک ایسی سرزمین پر جہاں تم اپنی صلاحیتوں کا استعمال صحیح راستے پر کر سکتے۔

کیا دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی؟

اِس جواب سے پتا چلتا ہے کہ ملائکہ کی منطق اور عقلمند انسانوں کی منطق بالکل یکساں ہے۔ انسان کی عقل بھی یہی کہتی ہے:

"اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا۔"

"کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔"

اب اُن کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا، وہ بیچارے کیا کہیں، پتا ہے اُن کے پاس اِس

کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔لہٰذا قرآن کریم ان بیچاروں کے انجام کے بارے میں کہتا ہے:

"فَأُولٰئِكَ مَأْوٰاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآئَتْ مَصِيْرًا۔"

وہ مستضعفین جن کی قوتیں اور صلاحیتیں طاغوتوں کے ہاتھ میں تھیں، اُن کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور یہ انسان کے لئے کیسا بُرا ٹھکانہ اور انجام ہے۔

البتہ یہاں بھی ایک استثنا پایا جاتا ہے، کہ سب کے سب لوگ ہجرت نہیں کر سکتے، تمام لوگ اپنے آپ کو جاہلی نظام کی اس قید سے نجات نہیں دلا سکتے۔ کچھ لوگ ناتواں ہیں، کچھ بوڑھے ہیں، کچھ بچے ہیں، کچھ عورتیں ہیں، جن کے لئے ہجرت ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا یہ لوگ مستثنا کئے جاتے ہیں:

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا۔[1]

"سوائے اُن ضعیف و ناتواں مردوں، عورتوں اور بچوں کے جن کے پاس کوئی چارہ نہیں اور جن سے کچھ نہیں بن پڑتا۔"

ان کے پاس خطہ نور، خطہ اسلام اور خدا کی عبودیت کی سرزمین کی جانب نے کی کوئی راہ نہیں، اور جو کچھ نہیں کر سکتے۔

فَأُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ط

"پس وہ لوگ جو کچھ نہیں کر سکتے، امید ہے خداوندِ متعال اُنہیں معاف کر دے۔"

وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا۔[2]

"اور خدا درگزر اور مغفرت کرنے والا ہے۔"

---

[1] سورہ نساء ٤۔ آیت ٩٨

[2] سورہ نساء ٤۔ آیت ٩٩

اسکے بعد وہ لوگ جن کے لئے یہ خطاب حجت ہے، یہ نہ سمجھیں اور اُن کے ذہن میں یہ خیال نہ آئے کہ ہجرت اُن کے لئے بدبختی، ضرر اور نقصان کا باعث ہوگی، اور وہ بار بار اپنے آپ سے یہ نہ پوچھیں کہ مثلاً ہمارا کیا بنے گا؟ کیا ہم کچھ کر بھی سکیں گے یا نہیں؟ کیا کچھ حاصل بھی ہوگا یا نہیں؟

ایسے لوگوں کے جواب میں قرآن مجید فرماتا ہے:

"وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ" [۱]

اور جو بھی راہ خدا میں ہجرت اختیار کرتا ہے، وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور وسعت پاتا ہے۔"

دنیا اسکے لئے پرواز کا ایک کھلا آسمان ثابت ہوتی ہے، اور وہ زادی کے ساتھ اس میں پرواز کرتا ہے۔ نظامِ جاہلی میں ہم کتنا ہی اونچا اُڑتے، پنجرے سے اونچا نہیں اُڑ سکتے تھے، لیکن اب ایک حیرت انگیز وسیع وعریض افق ہمارے سامنے ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور کے بیچارے مسلمان مسجد میں بڑی مشکل سے نماز پڑھ پاتے تھے، اگر جذبہ ایمانی زیادہ ہی جوش مارتا تو مسجد الحرام میں دو رکعت نماز ادا کر پاتے، اسکے بعد اُنہیں بُری طرح زدوکوب ہونا پڑتا۔ } اُس دور میں { یہی مسلمانی کی انتہا تھی، اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن جب ان لوگوں نے ہجرت کی اور زادسر زمین میں، اسلامی معاشرے اور ولایتِ الٰہی کے تحت زندگی بسر کرنے لگے، تو دیکھا کہ یہ ایک عجیب جگہ ہے:

يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ۔ [۲]

---

[۱] سورہ نساء ٤۔ آیت ١٠٠

[۲] سورہ مومنون ٢٣۔ آیت ٦١

یہاں پر لوگوں کا مقام و مرتبہ یہ قرآن اور تقویٰ اور عبادت کے ذریعے متعین اور معلوم ہوتا ہے۔ جو شخص راہِ خدا میں زیادہ جدو جہد اور زیادہ خدا کی عبادت انجام دے، جہاد اور راہِ خدا میں خرچ کرے، وہ زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ کل کے مکی معاشرے میں، اگر کسی کو پتا چل جاتا کہ فلاں شخص نے راہِ خدا میں ایک درہم دیا ہے، تو اسے گرم سلاخوں سے ایذا پہنچائی جاتی تھی، شکنجوں میں کس کر اسے آگ سے جلایا جاتا تھا۔ لیکن جب انہوں نے راہِ خدا میں ہجرت کی، اور مدینۃ الرسول میں چلے ئے، تو دیکھا کہ کیسی کھلی فضا اور پرواز کی جگہ ہے، کس طرح انسان حسبِ دل خواہ پرواز کرسکتا ہے:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ط

اور جو کوئی راہِ خدا میں اور الٰہی اور اسلامی معاشرے کی طرف ہجرت کرتا ہے، وہ بکثرت ٹھکانے پاتا اور وسعتوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔

اب اگر تم نے راہِ خدا میں دارکفر سے دارِ ہجرت کی جانب حرکت کی، اور درمیانِ راہ میں خدا نے تمہاری جان لے لی، تب کیا ہوگا؟

قرآن کہتا ہے: اس وقت تمہارا اجر و پاداش خدا کے ذمے ہے۔ کیونکہ تم نے اپنا کام کر دیا، جو فریضہ تم پر واجب تھا اسے انجام دے دیا، اور تم نے حتیٰ الامکان کوشش اور جدو جہد کی۔ اسلام یہی چاہتا ہے، اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان اپنی توانائی کے مطابق، جتنی وہ صلاحیت رکھتا ہے اتنی، اور جتنی اسکی استطاعت ہے اتنی راہِ خدا میں جدو جہد کرے۔

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ [1]

اور جو کوئی خدا اور رسول کی جانب ہجرت کے ارادے سے اپنے گھر سے نکلے

---

[1] سورہ نساء ٤۔ آیت ١٠٠

اور راستے میں اسے موت جائے، تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

توجہ رکھئے گا کہ کیونکہ یہ گفتگو ولایت کے موضوع پر خری گفتگو ہے، یہ بحث تقریباً ڈھی باقی رہتی ہے، لہٰذا ہم اِس نکتے کو عرض کرتے ہیں کہ ہجرت دارالکفر ، غیر خدا کی ولایت، شیطان اور طاغوت کی ولایت سے دارالھجر ت، دارالایمان، ولایتِ الٰہی کے زیرِ فرمان، ولایتِ امام کے زیرِ فرمان، ولایتِ پیغمبر اور ولایتِ ولی الٰہی کے زیرِ فرمان سرزمین کی جانب ہوتی ہے۔ لیکن اگر دنیا میں ایسا کوئی خطہ ارضی موجود نہ ہو، تو کیا کیا جانا چاہیے؟

کیا دارالکفر ہی میں پڑے رہنا چاہیے؟

یا ایک دارالھجر ۃ ایجاد کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے؟

خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ہجرت کی۔ لیکن پیغمبرؐ کے ہجرت کرنے سے پہلے ایک دارالھجر ۃ موجود نہیں تھا، آپ نے اپنی ہجرت کے ذریعے ایک دارالھجر ۃ ایجاد کیا۔

کبھی کبھی یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ لوگوں کا ایک گروہ اپنی ہجرت کے ذریعے دارالایمان کی بنیاد رکھے، ایک الٰہی اور اسلامی معاشرہ بنائے، اور پھر مومنین وہاں ہجرت کریں۔

یہ ہے ہجرت کے موضوع پر ہماری گفتگو کا ماحصل۔

رہبری کے شرائط

دوشرط اساسی

دو بنیادی شرطیں: وہ شرائط جو زعامت اور رہبری کیلئے ضروری ہیں انکا سرچشمہ براہ راست حکومت اسلامی کے انداز طبیعت سے ظاہر ہوتا ہے عقل وتدبیر جیسی عام شرائط کے علاوہ دو بنیادی شرطیں ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں

1: قانون کے بارے میں علم وآگاہی کا ہونا

2: عدالت کا ہونا

جیسا کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اس بات میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا کہ منصب خلافت کس کو سنبھالنا چاہیے لیکن اس کے باوجود مسلمان اس بات پر متفق تھے کہ منصب خلافت پر فائز ہونے والے شخص کو عالم وفاضل اور آگاہ ہونا چاہیے اختلاف صرف دو موضوعات میں تھا:

1۔ چونکہ اسلام کی حکومت قانون کی حکومت ہے لہٰذا رہبر وزعیم اور حاکم کیلئے قانون کے بارے میں علم وآگاہی ضروری ہے جیسا کے روایات میں بھی وارد ہوا ہے صرف رہبر وحاکم کیلئے ہی نہیں بلکہ تمام افراد کیلئے ضروری ہے کہ وہ جس کام اور مقام پر فائز ہوں اس کے بارے

میں علم و آگاہی رکھتے ہوں البتہ حاکم ورہبر کیلئے ضروری ہے کہ وہ علمی میدان میں سب سے افضل واعلی ہو ہمارے ائمہ علیہم السلام اپنی امامت کیلئے اسی مطلب کو استدلال کے طور پر پیش کرتے تھے کہ امام کو دوسروں سے افضل ہونا چاہیے شیعہ علماء نے دوسروں پر جو اعتراضات وارد کئے ہیں وہ بھی اسی امر سے متعلق ہیں کہ جب فلاں حکم کے بارے میں خلیفہ سے معلوم کیا گیا تو خلیفہ اسکا جواب نہ دے سکے پس وہ امامت اور خلافت کے لائق وسزاوار نہیں ہے فلاں کام کو اسلامی احکام کے خلاف انجام دیا لہٰذا خلافت وامامت کے لائق نہیں ہے۔۔۔(1)

مسلمانوں کی نظر میں رہبر کے لئے قانون سے واقفیت اور عدالت دو بنیادی رکن اور شرائط ہیں اور اسمیں دوسرے امور کا موجود ہونا ضروری نہیں ہے مثلا ملائکہ کے علم کی کیفیت کے بارے میں، صانع تبارک وتعالیٰ کے علم کے بارے میں کہ وہ کن اوصاف کا حامل ہے، ایسے علوم کا امامت کے موضوع میں کوئی دخل نہیں ہے چنانچہ اگر کوئی تمام طبیعی علوم کے بارے میں معلومات فراہم کرلے اور طبیعت کی تمام قوتوں کو کشف کرلے یا میوزک کے بارے میں خوب جان لے پھر بھی اس میں خلافت کے منصب پر فائز ہونے کی صلاحیت ولیاقت پیدا نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس کو ان لوگوں پر افضلیت اور برتری حاصل ہوسکتی ہے جو اسلام کے قانون کو جانتے ہیں اور عادل ہیں اور حکومتی امور کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں

جو چیز خلافت سے متعلق ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہمارے ائمہ علیہم السلام کے زمانے میں اسکے بارے میں بحث اور گفتگو ہوتی رہی ہے اور مسلمانوں کے درمیان بھی مسلّم امر رہا ہے وہ یہ ہے کہ اوّلا حاکم اور خلیفہ کو اسلام کے احکام کے بارے میں معلومات ہونی چاہیے یعنی اسے اسلامی قانون کا ماہر ہونا چاہیے دوسرے یہ کہ اسے عادل ہونا چاہیے اور اعتقادی اور اخلاقی کمال کا حامل ہونا چاہیے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ اسلام کی حکومت قانون کی حکومت ہے نہ اس میں جاہ طلبی وخودغرضی اور نہ ہی اشخاص کی عوام پر حکومت کی کوئی گنجائش ہے

جو رہبر اور حاکم قانونی مطالب سے آگاہ نہ ہو وہ حکومت کے لائق وسزاوار نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر وہ تقلید کرے گا تو اس سے حکومت کی طاقت وقدرت مضمحل اور کمزور ہو جائے گی اور اگر تقلید نہیں کرے گا تو اسلام کے قانون کا حاکم اور مجری نہیں بن سکتا اور یہ بات مسلّم ہے کہ "الفقہاء حکام علی السلاطین" " فقہاء سلاطین پر حاکم ہیں" (2) سلاطین اگر اسلام کے تابع ہیں تو انکے لیئے ضروری ہے کہ وہ فقہاء کی اطاعت اور پیروی کریں اور اسلامی قوانین اور احکام کو فقہاء سے معلوم کرکے جاری کریں اس صورت میں حقیقی حکام وہی فقہاء ہیں لہٰذا ضروری ہے کے حاکمیت سرکاری طور پر فقہاء کے ہاتھ میں رہے نہ کہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہنی چاہیئے جو نادانی اور جہل کی بنا پر فقہاء کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں

2۔رہبر اور حاکم کو اخلاقی اقدار اور اعتقادی کمال کا حامل اور عادل ہونا چاہیے جو شخص حدود الٰہی یعنی اسلامی سزاؤوں کو جاری کرے گا اور بیت المال میں دخل اور تصرف کرنے کے امور کو سنبھالے گا اور حکومت کا نظام اپنے ہاتھ میں لے گا اور خداوند متعال اسکو اپنے بندوں پر حکومت کا اختیار بخشے گا اسکو گناہکار اور بدکردار نہیں ہونا چاہیے "ولا ینال عہدی الظالمین" (3) خداوند ظالم اور گنہکار کو ایسا حق واختیار عطا نہیں کرتا ہے

حاکم اگر عادل نہیں ہوگا تو اس صورت میں وہ مسلمانوں کے حقوق ادا کرنے، مالیات وصول کرنے اور انکو صحیح طریقے سے مصرف کرنے اور قانون کو صحیح طور پر اجراء کرنے میں عدل وانصاف کا لحاظ نہیں رکھے گا اور ممکن ہے وہ اپنے خاندان والوں ،قریبی ساتھیوں اور دوستوں کو معاشرے پر مسلط کردے اور مسلمانوں کے بیت المال کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کیلیئے مصرف کرنے میں مشغول ہو جائے (4)

مرجعیت کی شرط ضروری نہیں ہے

میرا ابتدا ہی سے اس بات پر اعتقاد تھا کہ مرجعیت کی شرط ضروری نہیں ہے وہ مجتہد کافی ہے جو عادل ہے اور جس کو ملک کی خبرگان کونسل کی تایید حاصل ہے عوام نے خبرگان کونسل کے نمائندوں کو اس لئے ووٹ دیا ہے کہ وہ انکی حکومت کیلئے رہبر معین کریں اور جب خبرگان کسی شخص کو رہبری کیلئے معین ومنتخب کریں گے تو اسکی رہبری وزعامت عوام کے لئے مورد قبول ہوگی اور اس صورت میں وہ عوام کا منتخب ولی بن جائے گا اور اسکا حکم نافذ العمل ہوگا (5)

رہبری کے نمونے

رہبر عدالت میں

صدر اسلام میں دو ادوار میں دو مرتبہ اسلام کی اصلی حکومت محقق اور قائم ہوئی ہے ایک مرتبہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اور دوسری مرتبہ حضرت علی علیہ السلام کے دور میں جب وہ کوفہ میں حاکم تھے ان دو ادوار میں معنوی قدریں حاکم تھیں یعنی عدل وانصاف پر مبنی حکومت برقرار تھی اور حاکم ایک ذرہ برابر بھی قانون کے خلاف عمل نہیں کرتا تھا ان دو دوروں میں قانون کی حکومت رہی ہے اور شاید اسکے علاوہ ہم کبھی بھی اس طرح کی قانون کی حکومت تلاش نہ کر سکیں گے ایسی حکومت جس کا ولی امر" جسے آج کی اصطلاح میں صدر یا سلطان سے تعبیر کرتے ہیں" قانون کے مقابلے میں معاشرے کی نچلی سطح کے فرد کے مساوی اور برابر ہو صدر اسلام کی حکومت میں ایسا رہا ہے حتی تاریخ میں حضرت علی علیہ السلام کا ایک واقعہ بھی موجود ہے: کہ جب حضرت علی علیہ السلام حاکم تھے اور انکی حکومت حجاز سے لیکر مصر اور ایران تک پھیلی ہوئی تھی اور گورنر و قضات سبھی ان کی طرف سے منصوب اور معین ہوتے تھے ایک دفعہ ایک یمنی نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف مقدمہ دائر کیا وہ یمنی بھی آپ کی حکومت کا ایک فرد تھا قاضی نے حضرت علی علیہ السلام کو طلب کیا قاضی بھی وہ تھا کہ جس کو خود حضرت علی علیہ السلام نے منصوب کیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام قاضی کے پاس پہنچے تو قاضی حضرت

علی علیہ السلام کے احترام میں کھڑا ہونا چاہتا تھا امام علیہ السلام نے فرمایا کہ قضاوت میں تم ایک فریق کا احترام مت کرو میں اور میرا فریق دونوں مقدمہ میں برابر و مساوی ہیں اس کے بعد جب قاضی نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف حکم صادر کیا تو حضرت علی علیہ السلام نے خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا حکم قبول کرلیا

یہ ایسی حکومت ہے کہ جس کے قانون کے مقابلے میں سبھی مساوی اور برابر ہیں کیونکہ اسلام کا قانون الہٰی قانون ہے اور خداوند متعال کے سامنے سبھی مساوی اور برابر ہیں چاہے حاکم ہو یا محکوم چاہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو یا امام علیہ السلام اور چاہے عوام (6)

رہبر عوام کے درمیان

اسلامی حاکم اور راہنما دوسرے حکام "جیسے سلاطین اور جمہوری صدور" کے مانند نہیں ہے اسلام کا حاکم وہ حاکم ہے جو مدینہ کی اس چھوٹی سی مسجد میں تشریف لاتے اور عوام کی گفتگو سنتے تھے اور وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں مملکت کے امور تھے وہ بھی عوام کے تمام طبقات کی طرح مسجد میں جمع ہوتے تھے اور انکا اجتماع ایسا ہوتا تھا جسمیں اگر کوئی غیر آجاتا تھا تو وہ نہیں پہچان سکتا تھا کہ انمیں صاحب منصب اور صدر مملکت کون ہے اور معمولی لوگ کون ہیں لباس عام لوگوں جیسا، طرز زندگی عوام جیسی، عدل وانصاف کو برقرار کرنے کیلئے یہ طرز عمل تھا کہ اگر ایک معمولی شخص حکومت کے پہلے درجے کے شخص کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کرے تو وہ قاضی کے پاس پہنچ جاتے تھے اور قاضی اگر حکومت کے پہلے درجے کے شخص کو حاضر کرتا تھا اور وہ بھی حاضر ہو جاتے تھے (7)

ولایت فقیہ ڈکٹیٹری کے برعکس ہے

اسلام میں قانون حکومت کرتا ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی الٰہی قانون کے تابع تھے آنحضور قانون کے مطابق عمل کرتے تھے خداوند تبارک وتعالی کا ارشاد ہے جو میں چاہتا ہوں اگر اسکے خلاف تم عمل کرو گے تو میں تمہارا مؤاخذہ کروں گا اور تمہاری شہ رگ "وتینت" کاٹ دوں گا(8) اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (معاذ اللہ) ایک ڈکٹیٹر شخص ہوتے یا ایک ایسے شخص ہوتے کہ جس سے لوگ ڈرتے کہ اگر وہ کبھی موقع پا کر مکمل قدرت حاصل کرلیں گے تو ڈکٹیٹری کریں گے نہ کل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈکٹیٹر تھے اور نہ آج فقیہ ڈکٹیٹر ہوسکتا ہے(9)

فقیہ میں استبداد نہیں پایا جاتا ہے وہ فقیہ جو ان اوصاف کا حامل ہوتا ہے وہ عادل ہوتا ہے ایسی عدالت جو سماجی عدالت کی مظہر ہو ایسی عدالت جسمیں جھوٹ کا ایک کلمہ اسکو عدالت سے ساقط کردے گا، نامحرم پر ایک نظر اس کو عدالت سے گرا دے گی ایک ایسا انسان نہ غلط عمل کرسکتا ہے اور نہ کبھی غلط کرتا ہے(10)

رہبری کے اختیارات اور حکومت

اگر ایک لائق انسان جسمیں یہ دو خصلتیں پائی جاتی ہیں حکومت تشکیل دینے کیلئے کمربستہ ہوجائے اور حکومت تشکیل دیدے تو معاشرے کے امور کو چلانے کیلئے اس کو بھی وہی ولایت حاصل ہے جو ولایت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ) کو حاصل تھی اور تمام لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اسکے حکم کی اطاعت کریں اور اس سلسلے میں یہ وہم غلط ہے کہ معاشرتی اور سماجی امور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیارات حضرت علی علیہ السلام کے اختیارات سے زیادہ تھے اور حضرت علی علیہ السلام کے اختیارات ولی فقیہ کے اختیارات سے زیادہ ہیں البتہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

فضائل تمام عالم پر محیط ہیں اور انکے بعد حضرت علی علیہ السلام کے فضائل اور کمالات سب سے زیادہ ہیں لیکن معنوی فضائل و کمالات کا زیادہ ہونا حکومتی اختیارات میں اضافے کا سبب نہیں بن سکتا ہے کیونکہ فوج، سپاہ اور رضا کار دستوں کو تیار کرنے یا گورنروں کو مقرر کرنے یا مالیات وصول کرنے اور اسکو مسلمانوں کے مصالح میں مصرف کرنے میں جو اختیارات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا دوسرے ائمہ علیہم السلام کو حاصل تھے خداوند متعال نے انھیں اختیارات کو موجودہ حکومت کیلئے بھی قرار دیا ہے البتہ کوئی شخص معین نہیں ہے بلکہ عنوان "عالم عادل" ہے

جب ہم کہتے ہیں کہ وہ ولایت جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا دوسرے ائمہ علیہم السلام کے پاس تھی وہ غیبت کے دور میں فقیہ عادل کے پاس ہے اور اس سلسلے میں کسی کو اس وہم اور شک میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ فقہاء کا مقام بھی وہی ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ معصومین علیہم السلام کا ہے کیونکہ یہاں پر بحث مقام و منزلت سے نہیں ہے بلکہ بحث ذمہ داری اور وظائف سے متعلق ہے ولایت یعنی حکومت، ملک کے نظم و نسق کو چلانا، شریعت کے قوانین کا اجراء کرنا جو ایک سنگین اور اہم ذمہ داری ہے نہ یہ کہ اس سے کسی کیلئے غیر معمولی شان و منزلت پیدا ہو جاتی ہے اور اسکو معمولی حد سے بڑھا کر کسی اونچے مقام پر پہنچا دیتی ہے دوسرے الفاظ میں حکومت یعنی ملک میں نظم و نسق کو برقرار کرنا اور بہت سے افراد اس کو امتیاز تصور کرتے ہیں جبکہ یہ کوئی امتیاز نہیں بلکہ ایک سخت و سنگین اور دشوار ذمہ داری ہے

ایک اہم امر جس کی ولایت عہدیدار ہے حدود الٰہی کا جاری کرنا ہے (یعنی اسلام کے جزائی قوانین کا اجراء) کیا حدود کے اجراء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام (علیہ السلام) اور فقیہ کے درمیان کوئی امتیاز ہے؟ یا چونکہ فقیہ کا رتبہ بہت ہی کم ہے لہٰذا اسکو کمتر سزا تجویز کرنا چاہیے؟ زانی کی حد 100 کوڑے ہے اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ حد جاری کریں گے تو 150 کوڑے ماریں گے اور حضرت علی ؑ جاری کریں گے تو 100 کوڑے ماریں گے اور فقیہ جاری کرے گا تو 50 کوڑے

مارے گا ؟ یا یہ کہ حاکم اجرائی امور کا ذمہ دار اور عہدیدار ہے اور اسے خداوند متعال کے حکم کے مطابق حد جاری کرنا چاہیے، چاہے حاکم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں ،حضرت علی علیہ السلام ہوں یا حضرت علی علیہ السلام کے بصرہ یا کوفہ میں نمایندے یا قاضی ہوں یا موجودہ دور میں فقیہ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے اہم وظائف میں سے مالیات خمس وزکوۃ، جزیہ اور خراجیہ زمین کا ٹیکس وصول کرنا ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زکوۃ کتنی وصول کریں گے کیا ایک جگہ سے ایک دسواں حصہ (1/10) اور دوسری جگہ سے ایک بیسواں حصہ (1/20) وصول کریں گے؟

حضرت علی علیہ السلام خلیفہ ہوگئے تو وہ کیا کریں گے؟ آپ موجودہ دور میں فقیہ اور نافذ الکلمہ ہوگئے تو آپ کیا کریں گے؟ کیا ان امور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت کا حضرت علی علیہ السلام کی ولایت اور عادل فقیہ کی ولایت کے درمیان کوئی فرق ہے؟

خداوند متعال نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام مسلمانوں کا ولی قرار دیا ہے اور جب تک وہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہیں انکی ولایت حضرت علی علیہ السلام پر بھی جاری ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امام علیہ السلام کی ولایت تمام مسلمانوں حتی اپنے بعد والے امام علیہ السلام پر بھی نافذ ہے یعنی اسکے حکومتی احکامات اور اوامر سب پر نافذ و جاری ہیں اور وہ گورنروں کو منصوب اور معزول کرسکتا ہے

جیسا کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احکام الہٰی کے اجراء کرنے اور اسلام کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے پر مامور تھے اور خداوند متعال نے انکو مسلمانوں کا ہادی، ولی اور راہنما قرار دیا اور انکی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے اسی طرح فقہاء عادل بھی حاکم وولی وراہنما ہیں اور معاشرے میں احکام کے اجراء کرنے اور اسلام کے اجتماعی نظام کو برقرار کرنے اور چلانے پر مامور ہیں

حکومت احکام اوّلیہ میں سے ہے اور فرعی احکام پر مقدم ہے

اگر حکومت کے اختیارات فرعی احکام کے دائرے میں ہوں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کی جانی والی حکومت الہیہ اور ولایت مطلقہ بے معنی ہو کر رہ جائے گی لہٰذا حکومت جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت مطلقہ کا ایک شعبہ ہے اسلام کے احکام اوّلیہ میں سے ہے اور وہ تمام فرعی احکام حتی نماز، روزہ اور حج پر بھی مقدم ہے حاکم ایسی مسجد یا گھر کو منہدم کرنے کا حکم دے سکتا ہے جو سڑک کے راستے میں واقع ہے اور گھر کی قیمت صاحب گھر کو واپس کر سکتا ہے حاکم ضرورت کے موقع پر مسجد کو بند کر سکتا ہے ایسی مسجد کو خراب کر سکتا ہے جو ضرر و نقصان کا سبب ہو حکومت ایسی شرعی قراردادوں کو یک طرفہ طور پر باطل کر سکتی ہے جو عوام سے طے کی ہیں اور جو ملک کے مصالح اور اسلام کے خلاف ہوں اور ہر اس امر پر پابندی عائد کر سکتی ہے جو مصالح اسلام کے خلاف ہو چاہیے وہ امر عبادتی یا غیر عبادتی ہو حکومت حج جیسی اہم عبادت پر جانے سے روک سکتی ہے اگر وہ اسلامی ملک کے مصالح کے خلاف ہو (12)

ولایت اور محدود مالکیت کا حق

اسلام میں مشروع اموال کیلئے بعض حدود ہیں اور ایک امر جو ولایت فقیہ سے متعلق ہے وہ یہی حدود اور تحدید کا امر ہے اور جسے ہمارے روشن فکر افراد درک کرنے سے قاصر ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ولایت فقیہ کیا ہے،

اس کے باوجود کہ مالکیت کو شارع مقدس نے محترم قرار دیا ہے لیکن ولی فقیہ اگر اسی محدود مالکیت کو اسلام و مسلمانوں کے مصالح کے خلاف تشخیص دے گا تو وہ اسی جائز اور مشروع مالکیت کو ایک معین حد تک محدود کر سکتا ہے اور وہ فقیہ کے حکم سے مصادرہ اور ضبط کر لی جائے گی

(13)

1۔بحارالانوار،ج25،ص116؛نہج البلاغہ ص588،خطبہ 172؛الاحتجاج،ج 1 ص229

2۔مستدرک الوسائل ج17 ص321 "کتاب القضاۃ"،"ابواب صفات قاضی"، باب 11،حدیث 33

3۔سورہ بقرہ/124

4۔ولایت فقیہ۔61-58

5۔صحیفہ نور جلد21،ص129 تاریخ 9/2/68 شمسی

6۔صحیفہ نور جلد10،ص168169 تاریخ 17/8/58 شمسی

7۔صحیفہ نور جلد3،ص84 تاریخ 18/8/57 شمسی

8۔ اشارہ بہ آیات مبارکہ:4644سورہ الحاقہ میں ارشاد ہے"ولوتقوّل علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین"(اگر محمدﷺ جھوٹی باتیں ہماری نسبت دیتے تو ہم ضرور اسکو اپنے قہر میں گرفتار کر لیتے اور اسکی شاہ رگ کو کاٹ دیتے)

9۔صحیفہ نور جلد10 ص29،تاریخ 30/8/58 شمسی

10۔صحیفہ نور جلد11 ص133،تاریخ 7/10/58 شمسی

11۔ولایت فقیہ،ص9293

12۔صحیفہ نور جلد ج20 ص170،تاریخ 16/10/66 شمسی

13۔صحیفہ نور جلد10 ص138،تاریخ 14/8/58 شمسی

امت مسلمہ کو نبی اکرمؐ کے محور پر متحد ہونا چاہیے۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ امت اسلامی کے بے پناہ عشق اور والہانہ محبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امت مسلمہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محور پر متحد ہونے اور دشمنان اسلام کی تفرقہ انگیز اور اختلافات پھیلانے والی سازشوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔

رہبر معظم نے اسلامی ممالک کے سفراء کی موجودگی میں اپنے خطاب کے دوران علم و حکمت، تزکیہ واخلاق اور عدالت وانصاف کو بعثت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین اہم پیغام قرار دیا اور انسانی معاشرے کی مشکلات اور مصائب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اسوقت تمام انسانوں کو انبیاء الہی (ع) کی تعلیمات کی سخت ضرورت ہے اور اسلام وقرآن میں یہ تمام تعلیمات موجود ہیں۔

رہبر معظم نے معنوی علوم میں انسانی معاشرے کی پسماندگی اور اخلاق ومعنویت سے دوری کو دنیا کی تمام مشکلات اور جنگ وخونریزی کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: مروت، انصاف، محبت اور اخلاقی پاکیزگی کی طرف اسلام کی دعوت کی تمام قومیں خصوصا تمام ممالک کے اعلی حکام اور ممتاز افراد سخت محتاج ہیں۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے قیام عدالت کو انسان کی ابدی ضرورت اور انبیاء الہی (ع) کی بعثت کا دوسرا مقصد قرار دیا اور ایران میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی جانب اشارہ

کرتے ہوئے فرمایا: بعثت پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین اہم پیغامات، یعنی علم، اخلاق اور عدالت ملت ایران کے بنیادی اصولوں اور اساسی اقدار میں شمار ہوتے ہیں اور ہم سب کو ان اصولوں کے تحقق کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ رہبر معظم نے ان اصولوں پر کاربند رہنے اور اسلامی فرائض پر عمل کو گذشتہ اٹھائیس سالوں کی کامیابی کا راز قرار دیتے ہوئے فرمایا: اسلامی اصولوں سے پیچھے ہٹنا، طرح طرح کی مصلحتوں کے جال میں پھنسنا اور دنیا میں رائج مادی مکاتب فکر کی چاردیواری میں گرفتار ہونا، بے شک ناکامی اور شکست سے دوچار ہونے کا سبب ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی نے فرمایا: انسانی معاشرہ دو بڑی مصیبتوں میں مبتلا ہے اول: وہ غلط راستہ جو اقوام عالم کو نیکی اور سعادت کے راستے کے عنوان سے دکھایا جاتا ہے دوم: عالمی امور پر بدترین افراد کا حاکم ہونا۔

رہبر معظم نے انسانی معاشرے کی سب سے بڑی مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: آج بدترین افراد دنیا کی اصلاح کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔ امریکہ کی شیطانی اور مستکبر طاقت تمام انسانی معاشروں پر اپنی بے لگام حکومت مسلط کرنے کی کوشش میں مصروف ہے اور اسلام پر دہشت گردی اور بنیاد پرستی کا الزام لگا رہی ہے جبکہ مسلمانوں پر ظلم وستم اور دہشت گردی، جنگ و خونریزی کا اصلی سبب، خود امریکی حکومت ہے۔

رہبر معظم نے مسلمانوں میں بیداری، اسلامی شناخت کی طرف بازگشت، اور اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے اندر جرات و ہمت کو مسلم اقوام کے رنج و غم کا علاج قرار دیتے ہوئے فرمایا: امت مسلمہ قرآنی برکات اور اسلام کے نورانی احکام سے بہرہ مند ہیں اور امت مسلمہ، پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے تمسک کے سایہ میں انسانی حیات کو لاحق تباہ کن خطرات کا مقابلہ کرسکتی ہے۔